ماہنامہ
الندوہ
محرم 1431ھ / جنوری 2010ء
الندوہ کا طریقہ کار فکر اور عمل میں افراط وتفریط
سے بچ کر اعتدال کی راہ پر چلنا ہے۔
الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک، اسلام آباد، پاکستان۔ 46001
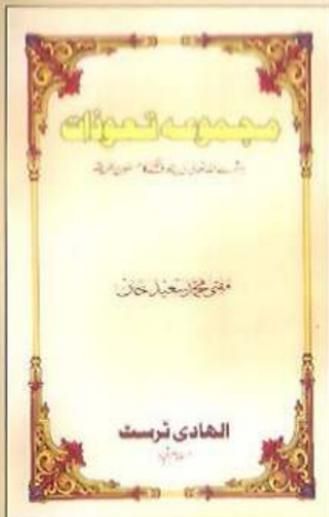
آفات و مصائب انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ان آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل ہو جائے وہ ان تمام تکالیف سے مامون ہو جاتا ہے۔

کن الفاظ کے ذریعے پناہ مانگی جائے..........؟

کتاب و سنت سے انہی الفاظ کو چن کر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اور ایسی دعائیں جمع کی گئی ہیں جنہیں روزانہ صبح و شام یا پھر دن میں ایک مرتبہ یا پھر ہفتے میں ایک بار توجہ سے پڑھنا، تعلق مع اللہ کے احساس کو اجاگر کرتا ہے۔

ادارہ المناد، شفیع پلازہ، بینک روڈ صدر، راولپنڈی۔
فون نمبر: 0092-51-5111725
موبائل: 0092-333-5134333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا.

(پ: ۱۰، س: التوبہ، آیت: ٤٠)

اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی کی بات بلند رہی۔

الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ کا ترجمان

جلد: 1 | اجراء: محرم 1431ھ رجنوری 2010ء | شمارہ: 1

مؤسس و مسؤل:

مفتی محمد سعید خان

الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھترپارک، اسلام آباد، پاکستان۔ 46001

فہرست مضامین

پتہ برائے خط وکتابت:

(1) الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، چھتر پارک،

اسلام آباد۔ پوسٹ کوڈ 46001

(2) الندوہ۔ پوسٹ بکس نمبر 1940

جی۔پی۔او۔ اسلام آباد

E-Mail: alnadwa@seerat.net

ٹیلی فون نمبر: 0092-51-2860164

موبائل: 0300-5321111

برائے ترسیل زر:

بنام: الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ

اکاونٹ نمبر 01-8637741-01

سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک پاکستان۔

پاکستان فی پرچہ: 25روپے

پاکستان سالانہ: 300روپے

بیرون ملک سالانہ: 25 امریکی ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف حصوں میں ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو مبعوث فرمایا تاکہ لوگ ان کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اپنے دین و دنیا کو سنواریں۔ ان مبارک ہستیوں میں سب سے آخری ہستی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی جنہیں گونا گوں صفات سے نوازا گیا تھا اور ان کا ایک نمایاں وصف یہ بھی تھا کہ زندگی کے حقائق کو بہت آسان اور مختصر الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ ایسے حقائق جو اپنی گہرائی میں سمندروں کی مانند تھے اور اپنی گیرائی میں کل جگ پر محیط۔

ایک ایسی ہی حقیقت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی؛

"انما یبعث الناس علی نیاتھم"۔[1]

(یقیناً لوگ قیامت میں اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔)

یہ جملہ ایک مشعل راہ ہے کہ زندگی کے تمام اعمال میں "نیت" کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

لغت میں "نیت" کے معنیٰ "کسی پھل کی گٹھلی کو دور پھینک دینا" کے آتے ہیں۔ چونکہ پھل کا گودا حاصل کرنے والا شخص گٹھلی کو ذرا فاصلے پر پھینک دیتا ہے اسلئے "اَلنَّوَاء" کے معنیٰ "دور ہو جانا" اور "اَنْوَي الرَّجُل"، "آدمی دور ہو گیا" کا محاورہ اس شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو بکثرت سفر کرتا ہے۔ اور "نیت" کو اسی لئے "نیت" کہا جاتا ہے کہ یہ دل کے ارادوں کو صحیح کرنے کا نام ہے اور یہ کام چونکہ ذرا

---

[1] سنن ابن ماجة۔ کتاب الزهد، باب النية، ج:٤، ص:٥٢٥۔

دیر سے ہوتا ہے اور مشقت طلب بھی ہوتا ہے اسلئے اس تاخیر کی وجہ سے دل کے ارادے کو نیت کہا گیا۔[1]
شریعت میں نیت کا معنی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کی اطاعت اور اس کی خوشی حاصل کرنے کیلئے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا عزم کرلے۔ کسی نیک کام کو کرنے کیلئے ٹھان لے کہ اس نیکی کو کرکے رہنا ہے کیونکہ اللہ تعالی اس سے خوش ہوگا یا یہ کہ اس گناہ کے قریب بھی نہیں جانا کیونکہ یہ بندگی کے منافی اور اللہ تعالی کو ناراض کرنے کی بات ہے تو "اللہ تعالی کے قرب اور اطاعت کیلئے کسی اچھے کام کو کرنے اور بُرے کام کو نہ کرنے کا عزم مصمم" نیت کہلاتا ہے۔[2]
اعمال کا ایک ظاہری وجود ہے جو کہ ہمیں اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے مثلاً کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم اس کے نماز پڑھنے کا تو اقرار کرسکتے ہیں لیکن نماز پڑھنے والا کس مقصد کیلئے نماز پڑھ رہا ہے، ہم اس کا فیصلہ نہیں کرسکتے کیونکہ ہم اس کے دل کے ارادے کو کسی صورت میں نہیں جانچ سکتے اور اعمال ہی کا ایک باطنی وجود بھی ہے یعنی وہ ارادہ (نیت) جس کے تحت کوئی انسان عمل کرتا ہے، اس ارادے سے واقف یا تو اللہ تعالی ہوتا ہے اور یا پھر وہ انسان جو یہ کام کر رہا ہے۔ عمل کے اس باطنی وجود (نیت) ہی پر عذاب وثواب کا دارومدار ہے۔ انسان جب کسی اچھے یا بُرے عمل کی نیت کر لیتا ہے

---

[1] [نوی]: و نوی الشيءَ ينويه نيّة، بالكسر مع تشديدالياء، ويخفّف؛ قصده و عزمه؛ و منه النية فإنّها عزم القلب و توجهه و قصده إلى الشيء.

(تاج العروس،نوی،ج:٢٠،ص:٢٦٦).

[2] (قوله: بالنيّة) بالتشديد، وقد تخفف، قهستاني. وهي لغة: عزم القلب على الشيء، و اصطلاحا – كما في "التلويح" –: ((قصد الطاعة و التقرب إلى الله تعالى في إيجاد الفعل))، ودخل فيه المنهيّات، فإن المكلّف به الفعل الذي هو كفّ النّفس. ثم العزم و القصد و النية اسم للإرادة الحادثة، لكن العزم المتقدم على الفعل، والقصد المقترن به، و النية المقترن به مع دخوله تحت العلم بالمنويّ، و تمامه في "البحر".

(شامي ،كتاب الطهارة، مطلب : الفرق بين النية و القصد والعزم، ج:١،ص: ٣٥٠).

تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل کا وجود بن جاتا ہے اور عالم ظاہر میں اس انسان کا عمل درحقیقت اس نیت یا ارادے ہی کی عملی شکل ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے صرف ارادہ انسانی ہی پر اسے ثواب عنایت فرمادیتا ہے اور گناہ کا ارادہ کرکے پھر اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنانے پر بھی ثواب دیتا ہے اور بسا اوقات شر کے ارادے کے بعد جب تک شر کا عمل اس ظاہری دنیا میں وجود پذیر نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ بھی اسے گناہ شمار نہیں کرتا۔

اچھے یا بُرے عمل کی محض نیت ہی سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے وجود کا تشکیل پاجانا ایسے ہی سمجھنا چاہئے جیسے کہ دنیا میں سورج یا چاند کا وجود ہر وقت پایا جاتا ہے لیکن بھری دوپہر میں چاند کے ہونے اور نصف شب کو سورج کے روشن ہونے کا حکم اسلئے نہیں لگایا جاتا کہ اگرچہ ان کا وجود تو ہے، لیکن ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کیلئے تو ان دونوں کا وجود معدوم نہیں اس ذات اقدس کیلئے کل کائنات عالم شاہد وحاضر ہے نہ کہ غائب، اسی طرح انسان جب کسی عمل کی نیت کرتا ہے تو اس عمل کا وجود اگرچہ ابھی ظاہر نہ ہوا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی وقت اس عمل کا وجود بن جاتا ہے۔ اسلئے انسان کو اپنے عمل سے زیادہ اپنی نیت کی فکر کرنی چاہئے کہ وہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کیلئے ہے یا نہیں کیونکہ ان کے دربار میں انسان کے اعمال سے زیادہ اس کی نیت پرکھی جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان نیک عمل کرکے بھی ثواب نہیں پاتا اور بعض اوقات گناہ کیے بغیر بھی پکڑا جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ نیکی کے پس پشت خراب نیت کارفرما تھی اور گناہ کا ظہور تو اگرچہ نہیں ہوا لیکن گناہ کا مصمم ارادہ ہی اسے گنہگار کرنے کیلئے کافی ہے۔

ان باتوں پر مزید غور و فکر کرنے اور نیت کی اہمیت کو جاننے کے لئے آپ اس حدیث شریف پر غور کیجیے؛

حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[1]

تین باتیں ایسی (سچی) ہیں کہ میں ان پر قسم کھاتا ہوں۔ اور تم سے یہ بیان کرتا ہوں، انہیں اچھی

---

[1] عن سعيد الطائي أبي البختري أنه قال: حدثني أبو كبشة الأنماري أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: –

طرح سے یاد رکھنا:

(۱) صدقہ کرنے سے کسی شخص کا مال کم نہیں ہوگا۔

(۲) جس شخص پر ظلم کیا جائے اور وہ (ظلم کا جواب دینے کی بجائے) اس ظلم پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس مظلوم کی عزت بڑھا دے گا۔

(۳) جس شخص نے (بغیر کسی ضرورت کے لوگوں سے) مانگنے کا دروازہ کھول لیا تو اللہ تعالیٰ اس شخص پر فاقے کا دروازہ کھول دے گا۔

اور میں تم سے ایک اور بات بیان کرنے لگا ہوں، اسے بھی اچھی طرح یاد رکھنا،

دنیا میں چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

(۱) وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دونوں سے نوازا ہے وہ مال کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اپنے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ اس مال میں اللہ تعالیٰ کا بھی حق بنتا ہے سو یہ شخص جنت کے اعلیٰ مقامات میں ہوگا۔

(۲) وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے صرف علم سے نوازا ہے اور مال میں وسعت نہیں دی مگر یہ اپنی نیت کا سچا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے مال مرحمت فرمائیں تو میں بھی ایسے ہی اچھے کام کروں جیسے کہ فلاں مالدار انسان کرتا ہے، تو اس شخص کی یہ پکی نیت قبول ہے اور یہ شخص اور دوسرا (جسے مال اور علم دیا گیا ہے) دونوں کا اجر برابر ہے۔

– ثلاثة أقسم عليهنّ و أحدّثكم حديثا فاحفظوه، قال: مانقص مال عبد من صدقة، و لا ظلم عبد مظلمة فصبر عليها إلا زاده اللّٰه عزا، و لا فتح عبد باب مسئلة إلا فتح اللّٰه عليه باب فقر أو كلمة نحوها، و أحدّثكم حديثا فاحفظوه، قال: إنما الدّنيا لأربعة نفر: عبد رزقه اللّٰه مالا و علما فهو يتّقي فيه ربه، و يصل فيه رحمه، و يعلم للّٰه فيه حقا، فهذا بأفضل المنازل. و عبد رزقه اللّٰه علما ولم يرزقه مالا، فهو صادق النية يقول: لو أن لي مالا لعملت بعمل فلان فهو نيته فأجرهما سواء. و عبد رزقه اللّٰه مالا ولم يرزقه علما، فهو يخبط في ماله بغير علم لا يتّقي فيه ربه، و لا يصل فيه رحمه، و لا يعلم للّٰه فيه حقا، –

(۳) وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے صرف مال دیا ہے اور اُسے علم نہیں ملا اور وہ اپنا مال بلا سوچے سمجھے خرچ کرتا ہے، اس معاملے میں نہ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، نہ ہی رشتے داروں سے اچھا سلوک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی پورے نہیں کرتا تو یہ شخص جہنم میں بدترین جگہ پر ہوگا۔

(۴) وہ شخص جس کے پاس نہ تو مال ہے اور نہ ہی علم ہے، لیکن اُسے یہ حسرت ہے کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو وہ بھی وہ گناہ کرتا (جو کہ جاہل مالدار کرتا ہے) تو یاد رکھو یہ شخص اور وہ (جسے صرف مال ملا ہے اور وہ اُسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کر رہا ہے) گناہ میں دونوں برابر ہیں۔

دوسرے شخص کو کس بات نے اجر کا مستحق ٹھہرایا اور چوتھے شخص کو کیوں گناہ ملا؟ اسلئے کہ دونوں کی نیتیں واضح تھیں، اول الذکر نیک اعمال کا متمنی تھا اور مؤخر الذکر اپنا دامن معصیت سے آلودہ کرنا چاہتا تھا دونوں نے کیا تو کچھ بھی نہیں لیکن ایک کی سچی نیت اُسے جنت کے بلند مقامات پر لے گئی اور دوسرے کی خالص گناہ کی نیت جہنم میں بدترین مقام پر۔

اسلئے ضروری ہے کہ کہ انسان ہمیشہ اپنی نیت پر غور کرتا رہے کہ وہ نیکی کس نیت سے کر رہا ہے اور گناہ میں اس کی نیت کا کتنا کچھ دخل ہے۔

خویلد کی صاحب زادی اُم المؤمنین حضرت سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ اُن کے ایک صاحب زادے عوّام بن خویلد تھے جن کے بیٹے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ تھے، جو کہ مشہور صحابی اور عشرہ مبشرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں شامل ہیں۔ انہی خویلد کے دوسرے صاحبزادے حِزام بن خویلد تھے، جن کے بیٹے حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ تھے اس نسب کے اعتبار سے حضرت زبیر اور حضرت خالد رضی اللہ عنہما ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی ٹھہرے۔ ابتداء اسلام میں مشرکین مکہ کے مظالم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے اَرض مکہ کی طنابیں کھینچ دیں۔ زندگی دشوار سے دشوار تر ہوئی،

- فهذا بأخبث المنازل. وعبد لم يرزقه الله مالا ولا علما فهو يقول: لو أن لي مالا لعملت فيه بعمل فلان فهو نيته فوزرهما سواء.

(ترمذي، كتاب الزهد، باب ماجاء مثل الدنيا مثل أربعة نفر، ج:٤ ص:٤٨٧، رقم الحديث:٢٣٢٥).

تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دیدی۔

حضرت زبیر بن عوّام بن خویلد رضی اللہ عنہ، خویلد کے پوتے اور ان کی اولاد میں سے پہلے شخص تھے جنہوں نے ہجرت حبشہ کیلئے اپنے مولدو مسکن مکہ مکرمہ زادہا اللّٰہ شرفاً و تعظیماً کو چھوڑا اور جب حبشہ پہنچے تو اپنے آبائی خاندان کے تنہا فرد تھے۔ جب یہ خبر پہنچی کہ ان کے چچازاد بھائی حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے حبشہ پہنچ رہے ہیں تو بہت مسرور ہوئے۔ انتظار کی گھڑیاں گننے لگے اور امید لگی کہ اپنے آبائی گھرانے کا ایک فرد وقیع بھی مہاجر بن رہا ہے۔

حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ نے بھی مکہ مکرمہ سے رخت سفر باندھا اور چل پڑے۔ تقدیر الٰہی میں طے تھا کہ ہجرت کا یہ سفر پورا نہ ہو اور نتیجہ یہ نکلا کہ راستے ہی میں ایک سانپ نے ڈس لیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی امیدیں حسرت میں بدل گئیں اور جب یہ خبر حبشہ پہنچی تو ان کیلئے اس سے زیادہ دُکھ کی گھڑی کوئی نہ تھی۔ بظاہر یہ ہجرت نا تمام رہی، حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ حبشہ نہیں پہنچ سکے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس ذات اقدس کیلئے انھوں نے یہ سفر کیا، کیا اس کے ہاں بھی یہ ہجرت نا تمام رہے گی؟

یقیناً ایسا نہیں ہے۔ اس نے خود اپنے پاک کلام میں یہ فرمایا؛

ومن یخرج من بیته مهاجرا الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله و کان الله غفورا رحیما.

(پ:۵ .س:النساء. آیت:۱۰۰)

اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہجرت کی نیت سے نکلے، پھر اس راہ میں اس کا انتقال ہو جائے تو ایسے شخص کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بار بار مہربانی فرمانے والا ہے۔

یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ خالد بن حزام رضی اللہ عنہ کی ہجرت نا تمام نہیں رہی، وہ مکمل ہوئی اور ایسی مکمل کہ اُن کا اجر اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے واجب کرلیا۔

بے شمار مفسرین اس آیتِ کریمہ کے ضمن میں اسی واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اسی سے شریعت کا یہ اہم مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی انسان کی نیت درست ہو اور اس صحیح نیت سے شروع کیا گیا کام بظاہر ناتمام رہ جائے، تو بھی وہ کام اللہ تعالیٰ کے ہاں مکمل ہی شمار کیا جاتا ہے اور حسن نیت کی وجہ سے کام کرنے والا اپنے اجر سے محروم نہیں رہتا۔

یہ ثابت کرنا کہ یہ آیتِ کریمہ اسی واقعے سے متعلق نازل ہوئی ہے، ذرا سا دشوار ہے، اس دشواری کا تذکرہ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں کیا ہے[1]۔ لیکن اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس آیتِ کریمہ کے مطابق حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ کو اُن کی حسن نیت اور سفر ہجرت کے آغاز کی وجہ سے ہجرت کا پورا پورا ثواب ملا۔ رضی اللّٰہ عنهم وعن سائر المهاجرين و الأنصار الى يوم الدين.

یہ حسن نیت مؤمن کا سرمایہ ہے۔ قیامت میں وہ یقیناً اپنے اعمال میں نیکیوں کا انبار پائے گا، اسلئے نہیں کہ وہ نیکیاں اس نے کی تھیں، بلکہ اس لیے کہ اس کی نیت سچی اور سُچی تھی اگر کوئی عذر نہ ہوتا اور حالات و واقعات مساعد ہوتے تو یہ جواں مردان نیکیوں کو نمٹا چکا ہوتا۔

عذر بظاہر اعمالِ خیر میں سدِّ راہ بن جاتا ہے لیکن نیت کی سچائی، عذر کی وجہ سے عمل خیر میں جو کوتاہی رہ جاتی ہے، اس کی کیسے تلافی کرتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2]:

> ”جو شخص رات کو بستر پر لیٹے اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ نیند کے بعد رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھے گا لیکن وہ سوتا ہی رہ جائے یہاں تک کہ صبح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی نیت کے مطابق (تہجد کا) ثواب

---

[1] وهذا الأثر غريب جدا، فإن هذه القصة مكية، ونزول هذه الآية مدنية، فلعله أراد أنها أنزلت تعم حكمه مع غيره، وإن لم يكن ذلك سبب النزول، والله أعلم. (تفسير ابن كثير، سورة النساء، ج: ٢، ص: ٣٥٨).

[2] عن أبي الدرداء رضي الله عنه يبلغ به النبي ﷺ قال من أتى فراشه وهو ينوي أن يقوم يصلّي من –

دے گا اور یہ نیند تو بس وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کو دیا ہے۔''

ارادے اور نیت کا سچا انسان، اگر آنکھ کھل جاتی تو آخر شب سر بسجود ہوتا لیکن غلبہ ٔنوم نے اس سحر خیزی سے محروم کر دیا۔ حسن نیت نے اس محرومی کی تلافی کر دی اور بندے نے تہجد کا اجر اپنے رب سے پالیا۔

اسلیے مومن انسان ہر وقت اس سعی مشکور میں مصروف رہتا ہے کہ اپنی نیت میں کھوٹ نہ آنے دے اور جو کام بھی کرے اللہ تعالیٰ کی خوشی اور اس کی رضا کی نیت سے کرے۔

نیت کی تصحیح محروم عمل کو محروم ثواب کی فہرست میں داخل نہیں ہونے دیتی

ے ے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔

ہمارے شیخ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نور اللہ مرقدہ بارہا یہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

''مومن، بدنیت کم لیکن بے نیت اکثر ہوتا ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروبارِ حیات میں ہم بیسیوں مباح کام بلا نیت کرتے چلے جاتے ہیں اور ان تمام مباحات کا شمار اگر گناہ میں نہیں ہوتا تو نیکی میں بھی نہیں ہوتا۔ ذرا سی توجہ تصحیح نیت کی طرف دی جائے اور یہ مشق کی جائے کہ ہم ہر کام سے پہلے نیت ضرور کریں گے، دل میں یہ ضرور سوچیں گے کہ یہ کام کیوں اور کس کیلئے کر رہے ہیں، تو جب صحیح نیت سے کسی مباح کام کو بھی کریں گے تو وہ کام فقہاء کی زبان میں مستحب اور عام زبان میں اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کے خانے میں لکھ لیا جائے گا۔

چلنا پھرنا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، آمد و رفت اور نوشت و خواند کی ضرورت کس ذی حیات کو پیش نہیں آتی۔ ان سب مباحات کو انسان حسن نیت سے اور نہایت آسانی سے اپنے لئے ہزاروں اور لاکھوں نیکیوں کا موجب بنا سکتا ہے۔ افسوس کہ عمومی غفلت کی وجہ سے یہ تمام کام خواہ بدنیتی سے نہ ہوں لیکن بے نیتی

– اللّیل فغلبته عیناه حتّی أصبح کُتب له مانوی و کان نومه صدقة علیه من ربه عزو جل.

(النسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب من أتی الی فراشه وهو ینوی القیام فنام، ج: ۳، ص: ۲۵۸، رقم الحدیث:۱۷۸۸)

ہی سے انجام دیے جاتے ہیں۔

مزید وضاحت کیلئے ایک مختصر سی مثال پیش کی جاتی ہے کہ جب پیاس بھڑکتی ہے تو پانی کی طلب کون نہیں کرتا؟ پانی تو پینا ہی ہے، لب تر کرنے سے پہلے صرف یہ نیت کرلی جائے، دل میں سوچ لیا جائے کہ اے اللہ آپ نے میرے اپنے نفس کا جو حق مجھ پر رکھا ہے، اس حق کو آپ کا حکم مانتے ہوئے اسلئے پورا کر رہا ہوں کہ اس اطاعت پر آپ مجھ سے خوش رہیں۔

بس یہ تصحیح نیت اتنی سہل اور آسان ہے کہ اگر تمام مباحات میں اس کی مشق کرلی جائے تو آخرت تو سنورے گی ہی دنیا بھی آسان ہو جائے گی۔

دنیا کی آسانی ایسے کہ ایسا منجھا ہوا مومن، حسن نیت کا خوگر، کبھی شیطان کے داؤ میں آ بھی گیا تو گناہ کرتے ہوئے نیت کیا کرے گا؟ حق یہ ہے کہ آتش معصیت سرد پڑ جائے اور بجائے گناہ کے قلب میں ندامت اور زبان پر استغفار کے کلمات جاری ہو جائیں۔

تزکیۂ نفس کا آغاز تصحیح نیت ہی سے ہوتا ہے اور جب قلب مصفی اور نفس مزکی ہو جاتا ہے تو احسان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قربِ الٰہی کی منازل طے ہوتی ہیں اور یہ مشتِ خاک اس مقام پر پہنچتی ہے کہ دل دیوانہ وار یہ پکارتا ہے؛

ے کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا، اپنا ہاتھ دے، مرے دستِ سوال میں

یہ سب ثمرات اُس بیج کے ہیں جو حسن نیت کے نام سے روح میں سمویا گیا تھا۔ تصحیح نیت انسان اور گناہ کے درمیان بہت بڑی آڑ ہے اسلئے کہ اللہ تعالی کی کوئی بھی نافرمانی اچھی نیت کے ساتھ نیکی نہیں بن سکتی۔

فرض کر لیجیے کہ کوئی شخص بینک لوٹتا ہے تاکہ وہ غربت کا خاتمہ کر سکے تو کیا اس اچھی نیت کی وجہ سے اس کی لوٹ مار درست قرار پائے گی؟ اچھی نیت سے گناہ کے کام کرنا تو اتنی خطرناک راہ ہے کہ شیطان اسی بہانے انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ پہلی مرتبہ تو وہ اسی نیت سے بینک لوٹتا ہے کہ انسانوں کے مسائل کو

حل کیا جا سکے لیکن آہستہ آہستہ وہ پھر اس لوٹ مار کو ثواب کا کام سمجھ کر کرنے لگتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں اس حرام (لوٹ مار) کو اُس نے حلال سمجھا اور اُس کا ایمان خطرے میں پڑا۔ حسن نیت کی صرف آڑ رہ جاتی ہے وگرنہ حرمت کو حلت میں تبدیل کرنا، کارِ ثواب ہے یا کفر؟ شراب اس نیت سے پینا کہ اچھا ہے شراب پی رہا ہوں، لوگوں کا خون تو نہیں چوس رہا، یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا خون چوسنے کے مقابلے میں شراب پی کر، کم حرام کام کر رہا ہے لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہا ہے جس دن وہ اُسے اچھا کام سمجھے، اُس دن اُسے اپنے ایمان کی خیر بھی منا لینی چاہیے۔

اس لئے تمام اعمال حسنہ کی اصل بنیاد حُسن نیت ہے۔ ثواب وعذاب کا دارومدار اسی پر ہے۔ اور یہی وہ گوہرِ بے بہا ہے جو دنیا میں عزت ومقبولیت اور آخرت میں مغفرت ونجات کا سبب بنتا ہے۔

حضرت الاستاذ ابوالقاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ[1] حُسن نیت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے:

> ملکہ زبیدہ کو بعد از وفات خواب میں دیکھا گیا تو دیکھنے والے نے پوچھا ''کہیے کیا گذری'' جواب ملا ''بخشش دی گئی'' کہا: ''اس لیے بخشش ہوگئی کہ آپ نے مکہ مکرمہ جانے والے راستے کو حاجیوں کی سہولت کے لئے درست کرا دیا تھا، کنوئیں اور سرائیں بنوا دی تھیں؟''
> فرمانے لگیں: ''ارے وہ سب کچھ تو انہی کے پاس رہ گیا جو آج ان جگہوں کے مالک ہیں ہماری مغفرت تو ان اچھی نیتوں کی وجہ سے ہوگئی جو ان تمام نیک کاموں کے کرتے وقت کی تھیں۔

اس لئے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی کہ راہِ خدا میں جو بھی کام کرنا ہے اسکی پہلی اینٹ اچھی نیت ہے، سو یہ کرو۔ تمام کام اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرنے کی نیت کرو۔ محدثین عظام اور فقہاء کرام رحمھم اللہ تعالیٰ نے صاحب جوامع الکلم حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام

---

[1] ونقل الأستاذ أبو القاسم القشيري قدس الله سره العلي، أن زبيدة رؤيت في المنام فقيل لها: مافعل الله بك؟ فقالت: غفرلي، فقيل لها: بكثرة عمارتك الآبار والبرك و المصانع في طريق مكة و إنفاقك فيها؟ فقالت: هيهات هيهات ذهب ذلك كله إلى أربابه، وأنما نفعنا منه النيات فغفرلي بها.

(مرقاة المفاتيح، حديث النية، ج ١، ص: ١٠٤).

احادیث کا بغور جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مومن انسان کی عملی زندگی جن ارکینِ اربعہ سے تشکیل پائی ہے، وہ کل چار احادیث ہیں؛

عُمْدَۃُ الدِّیْنِ عِنْدَنَا کَلِمٰتٌ مُسْنَدَاتٌ مِنْ قَوْلِ خَیْرِ الْبَرِیَّۃ

اُتْرُکِ الْمُشْبِّھَاتِ وَازْھَدْ وَدَعْ مَا لَیْسَ یَعْنِیْکَ واعْمَلَنْ بِنِیَّۃ

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے اچھی ہستی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی میں ہمارے نزدیک چار احادیث پورے دین کے ستون ہیں اور وہ یہ ہیں؛

(۱) جو کام شبہ میں ڈالیں اُن کاموں کو ترک کر دیں۔

یعنی جس کام کے بارے میں یہ شبہ ہو جائے کہ یہ جائز ہے یا نا جائز تو اس کام کو نا جائز سمجھ کر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ اسے جائز سمجھ کر، کر لیا جائے۔

(۲) جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اپنے دل کو اس پر مت رجھائیں۔

یعنی دنیا کی کسی بھی چیز کو حرص کی نگاہ سے دیکھنے کی بجائے، اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگیں۔

(۳) فضول کاموں کو چھوڑ دیں۔

یعنی وہ کام جس میں دنیا یا دین کا کوئی نفع نہ ہو ان میں پڑ کر اپنے وقت اور صلاحیتوں کو برباد نہ کریں۔

(۴) ہر عمل اچھی نیت کے ساتھ کریں۔

یعنی اچھی نیت تو آپ صرف نیک کاموں ہی میں کریں گے اور اس طرح رفتہ رفتہ گناہ کی زندگی سے نجات مل جائے گی۔

اس اعتبار سے غور کریں تو ''حُسن نیت'' کل دین اور شریعت کا ایک ربع (25 %) قرار پاتی ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہر معاملے میں اپنی نیت کو صاف رکھیں اور اپنے تمام اعمال میں رضاءِ باری تعالیٰ کی نیت کرتے رہیں۔

فیسمك اللهم بداء نا هذه الجريدة المسماة بـ" الندوه" فتقبلها منا و اجعلها مستمرة فشرعناها بك ولك و منك با حسن نيّاتنا واختم اللّٰهم بالخير منيا تنا و صلّ اللهم على سيد المرسلين و خاتم النبيين كما تحبّ و ترضىٰ، عدد ماتحب و ترضى.

اس کا ایک رکوع ہے		سورۂ فاتحہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے		اس کی سات آیات ہیں

① عربی میں ''سُوْر'' کے بنیادی معنی ''بلندی'' کے آتے ہیں اور سورت کو سورت یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک بلند مرتبہ کلام ہے اور اس میں عظمت پائی جاتی ہے اور یا پھر اس لیے کہ یہ لفظ ''اَسْــــاَرت'' سے بنا ہے جس کے معنی ''بقیہ'' یا ''پس خوردہ'' کے آتے ہیں اور سورت سے مراد قرآن کریم کا ایک حصہ، ٹکڑا یا جزو ہے۔ ان ایک سو چودہ (114) عظیم الشان اجزاء یا حد درجہ فصیح و بلیغ کلام کے ایک سو چودہ (114) حصوں سے ملکر یہ ''الکتاب'' یعنی قرآن حکیم مرتب ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان فرامین شاہی میں سے اپنے ہر ایک فرمان کو خود '' السورۃ '' ارشاد فرمایا ہے ؛

وَان کنتم فی ریب ممّا نزّلنا علی عبد نا فأتوا بسورۃ من مّثلہ.

(پ : ۱، س : البقرۃ، آیت: ۲۳)

اور اگر تمہیں اس (قرآن) کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہے، جو کہ ہم نے بندے (حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو اس (قرآن کی سورت) جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر ایک فرمانِ الٰہی کو سورت ہی فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو مسعود (عقبۃ بن عمرو الانصاری) رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے تو میں نے ان سے ایک سوال پوچھا، جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[1]

من قرأ الآيتين من آخر سورة البقرة في ليلة كفتاه.

جس شخص نے رات کو سونے سے پہلے "سورۃ البقرۃ" کی آخری دو آیات کی تلاوت کر لی تو یہ (تلاوت) اس (کی رات بھر کی عبادت کے ثواب) کے لیے کافی ہو جائے گی۔

② "فَتح" کھولنے کو کہتے ہیں اور درحقیقت یہ بندش کی ضد ہے۔ "مِفْتَاح" (KEY) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی دوسری چیز کھلے۔ اس سورت کو بھی "اَلْفَاتحة" (آغاز، شروع) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس سورت سے قرآن حکیم کا آغاز کرتے ہیں۔ کوئی شخص پورے قرآن کریم کو لکھنا چاہے تو وہ بھی اسی سورت سے آغاز کرتا ہے اور کوئی شخص پورے قرآن کریم کی تلاوت کرنا چاہے تو وہ بھی اسی سورت سے شروع کرتا ہے اس لیے آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کا دیباچہ (PREFACE) یا کلام الٰہی کا پہلا شہ پارہ (OPENING CHAPTER OF THE HOLY KORAN) ہے۔

اس سورت کے کئی ایک مزید نام بھی ہیں مثلاً:

1۔ فاتحة الكتاب 2۔ سورة الحمد، 3۔ سورة الصلاة 4۔ أمّ القرآن 5۔ الرُّقْيَة، وغیرہ وغیرہ۔

③ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں وحی کا آغاز تو سورۂ "العلق" کی ابتدائی آیات سے ہو چکا تھا لیکن پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی ہے، وہ یہی سورت ہے۔ نماز مکہ مکرمہ میں ہی فرض ہو گئی تھی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں سورۂ فاتحہ شامل نہ ہو اس لیے جو حضرات اس سورت کے مدینہ منورہ میں نازل ہونے کے قائل ہیں اگر ان کا موقف تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمان مکہ مکرمہ میں تیرہ 13

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب تحزیب القرآن، رقم الحدیث: ۱۳۹۷.

سال تک تمام نمازیں سورۂ فاتحہ کے بغیر ہی پڑھتے رہے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات احادیث اور تاریخ سے ملنے والی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

اسی طرح اُن حضرات کے مؤقف میں بھی کوئی وزن نہیں جو یہ تحریر فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی؛ پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور دوبارہ مدینہ منورہ میں۔ اگر یوں ہوا ہوتا تو یہ سورت قرآن کریم میں دو مقامات پر لکھی ہوئی ملنی چاہیے تھی لیکن ایسے نہیں ہے۔ یہ قطعاً قابل تسلیم نہیں ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، پھر وہ منسوخ بھی نہ ہوئی ہو لیکن ضبطِ تحریر میں صرف ایک مرتبہ لائی جائے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ اگرچہ کلام الٰہی سرتاسر نور ہی نور ہے لیکن اس سورت میں مزید انوار پائے جانے کی خوشخبری آپ کو مدینہ طیبہ میں دی گئی تھی۔

صحیح مسلم اور سنن النسائی کی روایات میں آتا ہے کہ:[1]

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: بينما جبريل قاعد عند النبي ﷺ سمع نقيضا من فوقه. فرفع رأسه. فقال: هذا باب من السماء فتح اليوم. لم يفتح قط إلا اليوم. فنزل منه ملك. فقال: هذا ملك نزل إلى الأرض. لم ينزل قط إلا اليوم. فسلم وقال: أبشر بنورين أوتيتهما لم يؤتهما نبي قبلك. فاتحة الكتاب و خواتيم سورة البقرة. لن تقرأ بحرف منهما إلا أعطيته.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اوپر سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ اُنہوں نے عرض کیا: ''یہ آسمان کے ایک ایسے دروازے کے کھلنے کی آواز ہے، جو آج تک نہیں کھولا گیا تھا''۔
اس سے ایک فرشتہ دنیا میں نازل ہوا،
دوبارہ عرض کیا: ''یہ ایک ایسا فرشتہ اس دروازے سے، دنیا میں آیا ہے جو آج سے پہلے کبھی اس زمین پر نہیں آیا''،

---

[1] صحیح مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب فضل الفاتحه و خواتيم سورة البقرة، رقم الحديث ٢٥٤ - (٨٠٦)، ج: ١، ص: ٤٤٧.

اس فرشتے نے سلام پیش کیا اور حضرت رسالت مآب صلی
اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ''میں آپ کو دو ایسے
نوروں کی بشارت دینے کے لیئے حاضر ہوا ہوں جو نور
آپ سے پہلے کسی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا نہیں کیے
گئے۔ (1) سورۂ فاتحہ (2) سورۂ بقرہ کی آخری آیات
(للہ مافی السمٰوت سے لیکر سورت کے اختتام تک)۔

اس روایت سے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۔ سورۂ فاتحہ، ۲۔ سورۂ البقرۃ کی آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بقیہ کلام کی نسبت سے زیادہ نور رکھا ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ سورت (الفاتحہ) مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ سورت پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب نماز فرض قرار دی گئی اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں اس وقت نازل ہوئی جب کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا، یا یہ کہ یہ سورت آدھی تو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور آدھی مدینہ طیبہ میں تو یہ دونوں آراء ایسی ہیں کہ نقل میں نہ تو احادیث، آثار اور تاریخ اِن آراء کی تائید کرتے ہیں اور نہ ہی عقل کی میزان میں ان کا کوئی وزن ہے۔

④ قرآن حکیم کی کسی بھی سورت کے اندر کی تقسیم دو[2] طرح پر ہوتی ہے؛

۱۔ سب سے بڑی تقسیم، اور اسے ''رکوع'' کہتے ہیں۔

۲۔ سب سے چھوٹی تقسیم، اور اسے ''آیت'' کہتے ہیں۔

کبھی پوری سورت صرف ایک[1] ہی رکوع پر مشتمل ہوتی ہے جیسے کہ سورۂ فاتحہ اور یا پھر تیسویں پارے میں سورۂ ''عبس'' سے لیکر سورۂ ''الناس'' تک کی یہ آخری پینتیس[35] سورتیں صرف ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں۔

ہر رکوع میں آیات کی تعداد بھی یکساں نہیں ہے؛ مثلاً پارہ : 29 سورۂ ''المزمّل'' کا دوسرا رکوع

دیکھیں تو اُس میں صرف ایک آیت ہے۔ پارہ :3 سورۃ ''البقرۃ'' کی آیت:281 سے جو رکوع شروع ہو رہا ہے اُس میں فقط دو آیات ہیں اور پارہ:23 سورۃ ''الصّٰفّٰت'' کا دوسرا رکوع جو کہ آیت: 22 سے شروع ہو رہا ہے اس میں ترپن (53) آیات ہیں۔

رکوعات کی یہ تقسیم قرون اولیٰ میں نہیں تھی۔ علماء و مشائخ بخارا نے یہ تقسیم کی ہے اور انہوں نے اس بات کا لحاظ کیا ہے کہ رکوع میں آیات تو خواہ کتنی ہی ہوں مگر ایک بات یا ایک مضمون رکوع میں مکمل ہو جایا کرے اور اگر کہیں مضمون بہت طویل ہے تو پھر اُسے، انہوں نے دو[2] رکوعات میں تقسیم کر دیا ہے۔

اور دوسرا لحاظ یہ کیا ہے کہ ہر رکوع کم سے کم اتنا تو ضرور ہو کہ اگر نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد اس کی تلاوت کی جائے تو کم سے کم واجب قرآت کی مقدار پوری ہو جائے اس لیے قرآن حکیم میں کوئی ایک رکوع بھی ایسا نہیں ہے جس کی تلاوت سورۃ فاتحہ کے بعد کی جائے تو نماز نہ ہو۔

علماء و مشائخ بخارا کا یہ اجتہاد (رکوعات میں سورتوں کی تقسیم) ایسا نہیں ہے کہ اب موجودہ دور میں یا کبھی مستقبل میں کوئی شخص یا جماعت ان رکوعات کے مقامات تبدیل کرنا چاہے یا پھر کوئی نئی تقسیم کرنا چاہے تو یہ کوئی گناہ کی بات ہو۔

قرآن کریم کا کوئی بھی صفحہ دیکھیں تو اس کے کناروں پر ایک حرف نظر آئے گا ''ع'' یہ حرف درحقیقت رکوع کی علامت (ABBREVIATION) ہے۔

(1) ⟶ ۲۰
(2) ⟶ ع ۱۱
(3) ⟶ ۷

پھر اس ''ع'' میں ہر مقام پر قاری کو تین عدد ملیں گے ایک تو وہ جو اس ''ع'' کے اوپر ہوگا، دوسرا عدد وہ جو اس کے درمیان میں ہوگا اور تیسرا عدد جو اس کے نیچے ہوگا؛

ہر ''ع'' پر سب سے اوپر والا عدد (1) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ اس سورت کا کون سا رکوع ہے۔

ہر ''ع'' کے درمیان والا عدد (2) یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس رکوع سے پہلے والے رکوع سے لیکر اس رکوع تک کی درمیان آیات کی تعداد کیا ہے؟

اور ''ع'' کے نیچے والا عدد (3) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ رکوع اس پارے کا کتنواں رکوع ہے۔

مثلاً پارہ:11 میں سورۂ ''التوبۃ'' کا آخری رکوع ملاحظہ ہو:

۱۶ ←—— (1)
ع ←—— (2)
۵ ←—— (3)

اب یہاں پر

(1) کے سامنے (۱۶) کا عدد یہ بتاتا ہے کہ یہ اس سورت کا سولھواں (۱۶) رکوع ہے۔

(2) کے سامنے کا عدد (۷) یہ بتاتا ہے کہ پچھلے رکوع سے لیکر اس رکوع تک کی درمیانی آیات کی تعداد ساتھ ہے۔

(3) کے سامنے کا عدد (۵) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ رکوع اس پارے کا پانچواں رکوع ہے۔

⑤ ''آیۃ'' کا مطلب ہے علامت، کس بات کی علامت؟ اس بات کی کہ ایک جملہ پورا ہوا اور اب دوسرا جملہ شروع ہو رہا ہے، کسی بھی سورت کے اندر سب سے چھوٹی تقسیم کا نام ''آیت'' ہے۔ قرآن کریم کی آیات کا تعین حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا۔

مثلاً آپ نے فرمایا:[1]

سورة من القرآن ثلاثون آية تشفع لصاحبها حتى يغفرله: ﴿تبارك الذي بيده الملك﴾.

قرآن حکیم میں ایک ایسی سورت ہے جس کی 30 تیس آیات ہیں، اس سورت نے اپنے پڑھنے والے کیلئے اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کی تو وہ شخص بخش دیا گیا، وہ سورت: ﴿تبارك الذي بيده الملك﴾ (پ:29، سورة الملك) ہے۔

قرآن حکیم کی کل آیات کے شمار میں تمام قراء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کل آیات چھ ہزار 6000 سے کچھ زائد ہیں۔ البتہ اس سے کتنی آیات زیادہ ہیں؟ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق سبھی قراء کے شمار کی تعداد مختلف ہے۔ یہ اختلاف کتنا اور کن آیات پر ہے؟ علم قرآت کی کتابوں میں ان تمام اختلافات کی تفصیلات اگرچہ بآسانی دستیاب ہیں لیکن جب ایسے مواقع اور قرآت کے اختلافات کے بیانات آئیں گے تو وہاں پر بھی ان شاء اللہ یہ تصریحات ملتی رہیں گی............۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الصلاة، باب تحزيب القرآن، رقم الحديث: ۱۴۰۰.

① قربِ خداوندی

اہل علم نے یہ بحث کی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات طیبہ کے لیے ایصال ثواب کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس پر اشکال یہ ہے کہ پوری امت مسلمہ کے جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ در حقیقت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا ثواب تو خود بخود ہی آپ کو پہنچ جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص مزید ایصال ثواب کرتا ہے تو اس کا کیا فائدہ ہے، وہ ثواب تو آپ کو پہلے ہی سے خود بخود مل رہا ہے اور قربِ الٰہی میں اضافے کا باعث ہے، پھر مزید کچھ کرنا تو ایسی چیز کے لیے کوشش کرنا ہے، جو پہلے ہی سے حاصل ہے..........؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایصال ثواب کرنا بہت بڑی نیکی اور باعثِ ترقی درجات ہے کیونکہ قرب الٰہی لامتناہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سبحانہ و تعالیٰ حدود و قید سے ماوراء ہے ایسے ہی اس کے قرب اور درجات کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کو جو قرب آج حاصل ہے، وہ کل نہیں اور جو کل حاصل ہے، وہ پرسوں نہیں، ہر ہر لمحہ انہیں اللہ تعالیٰ کے مزید قریب کرتا ہے اور ہر ہر آن اُن پاک ارواح کے درجات بلند ہوتے ہیں اور یہی معاملہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے۔

اِس لیے جو بھی لوگ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صلاۃ و سلام، دعا اور ایصال ثواب کرتے ہیں اس سے روحِ طیبہ کو قرب الٰہی کے مزید درجات حاصل ہوتے ہیں۔

اس مسئلے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو دیکھ کر یہ دعا

مانگی:

اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيفاً وَ تَعْظِيماً وَمَهَابَةً وَزِدْ مَنْ حَجَّه وَاعْتَمَرَه تَشْرِيفاً وَتَكْبِيراً وَبِرّاً۔[1]

اے اللہ اس گھر کے احترام، عزت اور ہیبت میں اضافہ فرما اور جس کسی نے اس گھر کا حج اور عمرہ کیا ہو اُس کے شرف، احترام، بزرگی اور نیکی میں اسے ترقی دے۔

تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اس گھر کا طواف کیا ہے اور اس دعا کے مطابق اُن کے شرف، تعظیم اور نیکی میں اضافہ ہوا ہوگا تو جب ان ذواتِ طیبہ کے درجات میں اضافہ قابل فہم ہے تو خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ طیبہ کی ترقی درجات کے لیے کیوں کوئی رُکاوٹ ہوگی، وہ بھی ہر صلاۃ وسلام اور ایصال ثواب کے نتیجے میں ترقی پذیر ہوں گے۔

اس مسئلے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِي الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ، وَ اَصْلِحْ لِيْ آخِرَتِيْ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ۔[2]

"اے اللہ میرا دین سنوار دے جس میں میرے ہی کام کی حفاظت ہے، اور میری دنیا درست کر دے جس میں میری معیشت ہے، اور میری آخرت درست فرما دے جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے، اور مجھے زندہ رکھ جب تک

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الحج، باب[رقم:٤٩٣] الرجل اذا دخل المسجد الحرام مایقول، ج: ٨، ص: ٧٦٥.

[2] کتاب الذکر و الدعا و التوبة و الاستغفار، باب [١٨]: التعوذ من شرما عمل و من شرمالم یعمل، رقم الحدیث: ٧١-(٢٧٢٠)، ج: ٤، ص: ٢٤٣.

میرے لیے زندگی اچھی ہو، اور دنیا سے اُٹھالے جب میرے لئے موت بہتر
ہو، اور میری زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے کا سبب بنادے، اور موت کو ہر
بُرائی سے راحت کا باعث بنادے''۔

اس دعا میں یہ جو جملہ ہے''میری زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے کا سبب بنادے'' تو اپنی قبر مبارک میں وہ تواب بھی حیات ہیں، اور خود آپ کی اپنی اس دعا کے مطابق ہر لمحہ آپ کے لیے''خیر''میں اضافے ہی کا باعث ہے، ہر آن آپ کا علم، ثواب اور درجات بڑھ رہے ہیں۔ جملہ مسلمان جو نیکیاں کرتے ہیں، آپ کیلئے ایصال ثواب کرتے ہیں، صلاۃ وسلام کے گلدستہائے عقیدت پیش کرتے ہیں، ان سب سے آپ کے قربِ الٰہی میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے کیونکہ قربِ الٰہی کی کوئی حد نہیں ہے۔
پوری امت مسلمہ کا یہی مؤقف ہے اور یہی برحق ہے۔[1]

---

[1] وكذا اختُلف في إطلاق قول: اجعل ذلك زيادةً في شرفه ﷺ، فمنع منه شيخ الاسلام البلقيني و الحافظ ابن حجر؛ لأنه لم يرد له دليل، وأجاب ابن حجر المكي في الفتاوى الحديثية: (بأنّ قولَهُ تعالى: ﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ [طه - ١١٤] و حديث مسلم انه ﷺ كان يقول في دعائه: (واجعل الحياة زيادة لي في كل خير) دليل على أن مقامه ﷺ و كماله يقبل الزيادة في العلم و الثواب و سائر المراتب والدرجات، و كذا و ردفي دعاء رؤية البيت: (وزد من شرفه و عظمه و اعتمره تشريفاً الخ)، فيشمل كل الانبياء، ويدل على أن الدعاء لهم بزيادة الشرف مندوب، وقد استعمله الإمام النووي في خطبتي كتابيه الروضة و المنهاج و سبقه إليه الحليمي و صاحبه البيهقي وقد ردّ على البلقيني وابن حجر شيخ الإسلام القاياتيّ ووافقه صاحبه الشرف المناوي ووافقهما أيضا صاحبهما إمام الحنفيّة الكمال بن الهمام بل زاد عليهما بالمبالغة، حيث جعل كل ماصح من الكيفيّات الواردة في الصلاة عليه ﷺ موجودا في كيفية الدّعاء بزيادة الشّرف، وهي: اللّٰهم صل أبدا افضلَ صلواتك على سيدنا محمد عبدك ونبيّك ورسولك محمدٍ وّ آله و سلّم تسليما كثيرا وزده تشريفا وتكريما، وأنزله المنزل المقرّب عندك يوم القيمه أه.

(قسم العبادات ، باب صلاة الجنائز ،مطلب في اهداء ثواب القرأة للنبي صلى الله عليه وسلم ، تتمه، ج:٥، ص: ٣٧١).

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے یہی عبقہ ذکر کیا ہے: لیکن باوجود تلاش بسیار ان کی کتابوں میں اس جزئیہ تک ہنوز رسائی نہیں ہوسکی۔

حضرت علی بن موفق رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۲۶۵ھ میں ہوا، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے طبقے سے تھے، وہ دور، علم، تقویٰ اور اتباع سنت کا تھا، غیر شرعی اعمال پر سخت گرفت اور بدعات کا رد کیا جاتا تھا۔ ائمہ اہل السنۃ والجماعۃ ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور ان کے اعمال اہل زمانہ کے لیے قابل رشک تھے۔

ابواسحٰق مزکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے ابوالعباس محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ علی بن موفق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے) سے سنا کہ حضرت علی بن موفق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''میں نے 60 حج پیدل چل کر کیے، اور ان میں سے 30 حج حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے''۔

ابوالعباس محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میں نے بھی اپنے استاد علی بن موفق رحمۃ اللہ علیہ کی اس عمل میں اقتداء کی ہے اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سات (7) حج کیے ہیں اور ان کے ایصال ثواب کے لیئے ایک سو ستر (170) جانور ذبح کیے ہیں اور اب تک تقریباً بارہ ہزار (12000) مرتبہ قرآن کریم ان کی طرف سے تلاوت کیا ہے۔

ان کے شاگرد ابواسحٰق المزکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میں نے بھی اپنے استاد ابوالعباس محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کی اس طریقے میں پیروی کی ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سات (7) حج کیے ہیں اور سات سو (700) مرتبہ قرآن کریم پڑھ کر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ایصال ثواب کیا ہے''۔[1]

اللّٰھم صل وسلم و بارك ابداً افضل صلواتك و سلامك و بركاتك على سيدنا محمد

---

[1] تاریخ بغداد، رقم: ٦٥٥٠، علی بن موفق العابد رحمة الله عليه، ج: ١٢، ص: ١١٠).

وعلی اله واصحابه كثير اكثيرا، وزده تشريفاً وتكريما و انزله المنزل المقرب عندك يوم القيمه ،و اجزه عنا افضل ماجزيت نبيا عن امته ور سولاً عن قومه و صلّ على جميع اخوانه من النبين و المرسلين و الصالحين وأبلغهم منى السلام واردد علىّ منهم السلام برحمتك يا خير الرحيمن.

② ایمان اور نفاق میں فرق

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اس دور کے منافقین میں کیا فرق تھا؟ دونوں گروہ بظاہر ایمان لائے تھے۔ دونوں کے ظاہری اعمال یکساں تھے، دونوں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے اور دونوں گروہ صحبتِ نبوی کے حاضر باش تھے، پھر وہ کونسا فرق تھا جس کی وجہ سے پہلا گروہ (رضی اللہ عنہم) تو جنت کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز ہوا اور دوسرا جہنم کے نچلے طبقے میں گرادیا گیا؟

بہت سے فرق تھے!

چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

ایک فرق یہ بھی تھا کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو جاتا تھا جس کے لئے توبہ ضروری ہوتی تھی تو وہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کرتے تھے، خود کو شرعی حد کیلئے پیش کر دیتے تھے، توبہ کرتے تھے اور آپ سے یہ درخواست کرتے تھے کہ اس گناہ کیلئے آپ بھی اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کریں۔ اس توبہ واستغفار سے

ان کی لغزشیں معاف ہوتی تھیں اور وہ دوبارہ ایسے ہی اُجلے ہو جاتے تھے جیسے کہ وہ اس لغزش سے پہلے تھے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے؛

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا ''اللہ کے رسول میں نے ایک گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد جاری ہونی چاہئے تو آپ حد جاری فرما دیں''۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے گناہ کے بارے میں کچھ دریافت نہیں فرمایا اور نماز کا وقت ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی اور جب نماز مکمل ہوئی تو اس نے کھڑے ہو کر دوبارہ عرض کیا، ''آپ نے دریافت فرمایا: ''کیا آپ نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی''۔ انہوں نے عرض کیا ''جی ہاں''۔ تو ارشاد ہوا: ''بس اللہ تعالیٰ نے آپ کا گناہ یا آپ کی حد[1] معاف کر دی۔

یا تو یہ کہا جائے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دیدی گئی کہ ان صاحب کی خطاء معاف ہوئی اور یا پھر یہ کہ انہوں نے درحقیقت ایسا گناہ کیا ہی نہیں تھا جس پر حد واجب ہوتی

---

[1] عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: كنت عند النبي ﷺ فجاءه رجل فقال: يا رسول الله، إني أصبت حدا فأقمه علي، قال: ولم يسأله عنه، قال: و حضرت الصلاة فصلى مع النبي ﷺ فلما قضى النبي ﷺ الصلاة، قام إليه الرجل فقال: يا رسول الله، إني أصبت حدا، فأقم في كتاب الله، قال: (أليس قد صليت معنا؟). قال: (فإن الله قد غفرلك ذنبك، او قال: حدك)

(كتاب الحدود، باب من اصاب ذنبا دون الحد، رقم الحديث: ٦٨٢٣)

بلکہ خشیتِ الٰہی کے غلبے کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی تھی اور یا پھر یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نمازوں میں اتنا خلوص تھا کہ ان کی خطاؤں کو معاف کرانے کیلئے ان کی نمازیں ہی کافی تھیں۔

معاملہ کچھ بھی ہو لیکن ان کی شان یہی تھی کہ اپنے گناہ کا اعتراف، استغفار، توبہ کے ذرائع اختیار کرنا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت کہ توبہ قبول ہوئی اور خطاؤں سے درگذر ہوا۔

گناہ اس دوسرے گروہ (منافقین) سے بھی ہوتے تھے لیکن ان کے ہاں اپنے گناہوں پر ندامت اور ان کا اعتراف نہیں تھا، ندامت تو کجا وہ دیدہ دلیری سے کبائر کا ارتکاب کرتے تھے اور پھر ان کبائر کی تاویل بھی کرتے تھے۔

غزوہ تبوک میں یہ منافقین بغیر کسی عذر کے معرکۂ کارزار سے پیچھے رہے، محض جی چرایا اور جھوٹے بہانے بیان کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ.

(پ:۱۰ س:التوبۃ، آیت:۴۲)

اور اب وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں گے اور کہیں گے "اگر ہم میں استطاعت ہوتی تو ہم ضرور آپ (لوگوں) کے ساتھ (جہاد) میں شرکت کرتے" (یہ جھوٹی قسمیں کھا کر) وہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یقیناً یہ (منافقین) جھوٹے ہیں۔

یہ ہے اصل فرق کہ بجائے گناہ کے اعتراف کے جھوٹی تاویلات کا سہارا لے رہے ہیں۔

اعترافِ گناہ توبہ کے راستے کی پہلی سیڑھی ہے اور تاویلِ گناہ سے مسئلہ مزید سنگین ہو جاتا ہے۔

اعترافِ گناہ ضمیر کے زندہ ہونے کی علامت ہے اور تاویلِ گناہ بغاوت ہے۔

گناہ کا اعتراف پھر توبہ واستغفار کی فکر اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہنے کے ممکنہ ذرائع ڈھونڈنا یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی راہ ہے اور اس کا انجام جنت ہے۔

اور گناہ پر اصرار، پھر اس کی تاویل کرنا، استغفار سے بے فکری اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوفی یہ

منافقین کی راہ ہے اور اس کا انجام جہنم ہے۔

③ دو مرتبہ طہارت
(DOUBLE CLEANLINESS)

دنیا کے تمام مذاہب میں عبادات پائی جاتی ہیں؛ طریقہ اگر چہ مختلف ہے لیکن ہر مذہبی آدمی عبادت کے مرحلے سے گذرتا ہے۔ عبادت کرنے کی غرض کیا ہے؟ جس شخص سے بھی آپ یہ سوال کریں گے وہ مختلف اغراض و مقاصد کے ساتھ عبادت کی اس غرض کو ضرور بیان کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوشی حاصل کرنے کے لئے عبادت کی جاتی ہے۔

اسلام ہمیں ان عبادات کی بھی تعلیم دیتا ہے جن کی ادائیگی میں مالی یا جسمانی قوت صرف ہوتی ہے اور ایسے اعمال عام طور پر نفس انسانی پر گراں گذرتے ہیں اور ان عبادات کی بھی جو نہایت آسان اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں شامل ہیں لیکن ایسی آسان عبادت کبھی تو اس لیے نہیں کی جاتی کہ اس کام کے عبادتی پہلو کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور کبھی اس لیے نہیں کی جاتی کہ ایسی آسان عبادت کا علم نہیں ہوتا۔

عبادت خواہ آسان ہو یا مشکل؛ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشی انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جن نہایت آسان عبادتوں کے بجالانے سے اپنے بندوں سے خوش ہوتا ہے ان میں سے ایک عبادت پاک رہنا بھی ہے۔ صفائی اور پاکیزگی انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور اگر چہ جانور بھی صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں لیکن پاک رہنا تو ایسی خاص صفت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں سمو دیا ہے۔

قرآن کریم میں دو مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بات کو دو مختلف الفاظ کے ذریعے بیان فرمایا ہے؛

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ. (پ: ۱۰، س: التوبۃ، آیت: ۱۰۸)	اس (مسجد قبا) میں ایسے لوگ ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ خوب پاک اور صاف رہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بھی پاک، صاف رہنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ آیت کریمہ مدینہ منورہ میں مسجد قبا میں نماز پڑھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اُس پاکیزہ شہر میں کون مسلمان ایسا تھا جو پاک صاف رہنے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسجد قبا والوں کے پاک رہنے کو پسند فرمایا، اُن کی پاکیزگی کی تعریف کی اور انہیں خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اس پاکیزگی کی وجہ سے بھی ان سے محبت کرتا ہے؟

یہ سوال سب سے پہلے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں آیا اور آپ نے مسجد قبا کے نمازیوں کو بلا کر دریافت فرمایا:[1]

ان اللہ قد اثنی علیکم فما الذی تصنعون عند الوضوء و عند الغائط؟	اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ لوگوں کے پاک رہنے کی بڑی تعریف کی ہے، آپ لوگ ایسی کون سی پاکی کا اہتمام کرتے ہیں؟

تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں عام طور پر اس سوال کے دو جوابات ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ:[2]

ولا ینا مون باللیل علی الجنابۃ.	وہ رات کو جنابت کی حالت میں نہیں سوتے۔

دن یا رات کسی بھی وقت کسی شخص کی حالت ایسی ہو جائے کہ پاک ہونے کے لیے اس پر غسل فرض ہو تو اگر وہ شخص یہ خیال کرتے ہوئے سوجاتا ہے کہ جب آئندہ نماز کا وقت آئے گا تو بیدار ہو کر غسل کر لوں

---

[1] التفسیر المظھري ،سورۃ التوبۃ،آیت:۱۰۸،ج:٤،ص:۲۹۹.

[2] معالم التنزیل ،سورۃ التوبۃ ، آیت : ۱۰۹، ج : ۲، ص: ۳۲۸.

گا، پاک ہو جاؤں گا تو شریعت اگرچہ اس نیند کی اجازت بھی دیتی ہے اور وہ شخص گنہگار بھی نہیں ہوتا لیکن مسجدِ قبا کے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے پاک تھے کہ اس حالت میں سونا بھی پسند نہیں کرتے تھے، پاک ہو کر سوتے تھے اور ان کی یہ طہارت ایسی پسند کی گئی کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہیں اپنی محبت کی سند مرحمت فرمائی۔

آج لوگ اگر تھوڑی سی ہمت کر کے اس طرح پاک ہو جائیں تو یقیناً اس آیت کی بشارت میں وہ بھی شریک ہوں گے۔

دوسرا جواب یہ تھا کہ:[1]

فقالو یا رسول اللہ نتبع الغائط الأحجار الثلثة ثم نتبع الاحجار المآء فتلافیہ ﴿رجال یحبون ان یتطهروا﴾.	مسجد قبا کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر تین پتھروں سے استنجاء (WASHING THE PRIVATE PARTS) کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں''۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کے جواب کی تصدیق کے لیے) یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ''اس مسجد (قبا) میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ خوب پاک وصاف رہیں'' اور پھر حکم دیا:[2]

"هو ذاك فعليكموه"	درست ہے، ٹھیک ہے آپ لوگ ضرور اس طریقے کو جاری رکھیں:

اس سے معلوم ہوا کہ وہ حضرات پاکیزگی کے اس عمل کو دو بار (TWICE) کرتے تھے ایک مرتبہ پتھر یا مٹی کے ڈھیلے استعمال کرتے تھے اور پھر دوسری مرتبہ پانی۔

---

[1] التفسير المظهري، سورة التوبة، آیت:۱۰۸، ج:٤، ص:۲۹۹.

[2] الجامع لأحكام القرآن، سورة التوبة، آیت ۱۰۸، ج: ۸، ص: ۲٦۰.

اس جدید (MODERN) دور میں یہ عمل اور بھی آسان ہو گیا ہے۔ جو مقصد اُس زمانے میں ڈھیلے یا پتھر استعمال کر کے حاصل کیا جاتا تھا، آج وہی مقصد ٹشو پیپر (TISSUE PAPER) استعمال کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی شخص گندگی سے پاک ہونے کے لئے پہلے ٹشو پیپر استعمال کرے اور پھر اس کے بعد پانی استعمال کر لے تو وہ یقیناً ایسی ہی طہارت حاصل کرے گا جیسی کہ وہ مسجد قبا والے کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طریقے کو سراہا (APPRECIATE) ہے۔

لوگ اگر اس آسان مسئلے کو جان کر اس پر عمل شروع کر دیں اور زیادہ پاکی کے لئے دو مرتبہ طہارت (DOUBLE CLEANLINESS) پہلے ٹشو پیپر اور پھر پانی کا استعمال، اپنی عادت بنالیں تو یہ ایسی آسان عبادت ہے کہ ایک تو صفائی وستھرائی حاصل ہو جائے گی جو کہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور دوسرے اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے خوش بھی ہوگا اور اپنی محبت نچھاور کرے گا کیونکہ اس نے کہا ہے کہ ''وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو خوب پاک اور صاف رہتے ہیں''۔

دوسرے مقام پر ذکر پھر طہارت اور پاکیزگی ہی کا ہے، بات وہی ہے لیکن الفاظ میں تبدیلی ہے؛

ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. (پ: ۲، س: البقرة، آیت: ۲۲۲)	یقیناً اللہ تعالیٰ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو کثرت سے توبہ کریں اور اُن سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک، صاف رہیں۔

سورۂ ''التوبۃ'' میں ایک طہارت کا ذکر تھا یعنی جسمانی طہارت اور پاکیزگی، یہاں سورۂ ''البقرۃ'' میں دو طہارتوں کا ذکر ہے؛ روح کی طہارت یعنی توبہ، اور جسم کی طہارت یعنی پاک کرنے والی اشیاء پانی، مٹی وغیرہ کا استعمال۔ نتیجہ دونوں کا ایک! اور وہ ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کی محبت''۔

جسم پاک ہو تو بھی اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور روح پاک ہو تو بھی محبت کرتا ہے اس لیے جو شخص اپنے جسم کو پانی، مٹی، ٹشو پیپر کے ذریعے پاک رکھے گا اور روح کی پاکیزگی کے لیے کثرت سے توبہ کرتا رہے گا تو جب اس نے دو طہارتیں اختیار کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی محبت بھی اُسے دُہری (DOUBLE)

ملے گی۔

توبہ درحقیقت رجوع کرنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو جب جسم میں داخل کیا تھا تو وہ بالکل پاک اور بے داغ تھی، جب انسان گناہ کرتا ہے تو اُس پر ایک داغ لگا دیتا ہے۔ توبہ درحقیقت گناہ کے داغ سے روح کو پاک کرنے ہی کا نام ہے۔ جب وہ استغفار کرتا ہے تو اس کی روح اپنی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرتی ہے اور پاک ہو جاتی ہے۔

جیسے کوئی شخص بھی جسمانی گندگی سے پاک نہیں، اسے روزانہ پاکیزگی حاصل کرنی پڑتی ہے اسی طرح کوئی بھی روح ایسی نہیں ہوتی جو معصیت کی آلودگی سے اکثر و بیشتر ناپاک نہ ہو جاتی ہو۔ اس لیے جب روح گنہگار ہو جاتی ہے تو اُسے بھی غسل کی ضرورت پیش آتی ہے روح کے اِس غسل کا نام "توبہ" ہے۔

اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ وہ ہے جو جسم کو پاک کرتا ہے...... پانی سے،

اور روح کو پاک کرتا ہے ...... توبہ سے۔

شام (SYRIA) سے فوج کا ایک دستہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں ان میں وہ ایک بہادر شامی شخص نظر نہیں آیا جو پہلے حاضر ہوا کرتا تھا، آپ نے اس کی غیر حاضری کے متعلق دریافت فرمایا تو اس کے دوستوں نے کہا: "وہ شراب کا رسیا ہو گیا ہے"،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کاتب کو بلایا اور فرمایا یہ خط لکھو:

عمر بن خطاب کی طرف سے فلاں صاحب کے نام:

"میں آپ کے سامنے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں، جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ گناہوں کو بہت زیادہ معاف کر دیتا ہے، وہ توبہ بھی بہت قبول کرتا ہے، اور اس کی پکڑ بھی بہت سخت ہے، بڑی طاقت کا مالک ہے، اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اُسی کی طرف واپس جانا ہے"

(درحقیقت یہ پ: ۲۴، س: المومن، آیت: ۳، ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کو توبہ کرنے پر معافی کی امید دلائی ہے اور اپنے عذاب سے ڈرایا ہے)

پھر آپ نے اس کے لیے دعا مانگی اور جو لوگ آپ کے پاس حاضر تھے، آپ کی دعا پر آمین کہتے رہے۔ اور دعا کیا تھی...... یہ کہ ’’اللہ تعالیٰ اس کے دل کو پھیر دے اور اسے توبہ کی توفیق دے‘‘۔

اس شخص کے پاس خط پہنچا تو اس نے پڑھا اور بولا:

’’غَافِرِ الذَّنبِ ‘‘(گناہوں کو بہت معاف فرمانے والا)

میرے رب نے وعدہ کیا ہے کہ میرے گناہ معاف فرمادے گا۔

’’وَقَابِلِ التَّوبِ شَدِیْدِ العِقَابِ ‘‘(وہ توبہ بھی بہت قبول کرتا ہے، سخت سزا دینے والا ہے)

مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی پکڑ سے ڈرایا ہے۔

’’ذِی الطَّوْلِ ‘‘(بڑی طاقت کا مالک ہے)

اور اُس کی طاقت تو سراسر خیر ہے۔

وہ اِسی آیت کو بار بار دُہراتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ وہ گناہ پر ندامت کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک جب اس صورتحال کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا:

’’جب تم اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ وہ صحیح راہ سے بھٹک گیا ہے تو اسے سیدھی راہ پر لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ اسے توبہ کی توفیق دے۔ اور اپنے بھائی کے خلاف (اسے شرمندہ کر کے یا اس کے گناہ کی تشہیر کر کے) شیطان کے مددگار مت بنو‘‘۔[1]

شیطان یہ چاہتا ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کر کے مومن اپنی روح کو پاک نہ کرے۔ اب جب معاشرہ اس گنہگار کا مذاق اڑائے گا، اُسے توبہ پر آمادہ کرنے کی بجائے مزید سرکشی پر ابھارے گا تو ایسا معاشرہ گنہگار کے برعکس شیطان کا مددگار ہوا کرتا ہے۔ بچے بھی تو گندگی میں لتھڑ جاتے ہیں، پھر شفیق ماں باپ ان کے جسم کو پاک کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

---

[1] حلیة الاولیاء، رقم: ۲۵۲ یزید بن الاصم، ج: ٤، ص: ۹۷۔

گنہگار کے ساتھ محبت وشفقت یہی ہے کہ اس کی روح کو پاک کرنے کے لیے،ہم بھی اس کی مدد کریں۔

سبحنك اللّٰهم و بحمدك اللّٰهم اغفرلی انك انت التّواب الرّحیم۔

④ کامیابی کاراز، مستقل مزاجی

بہت سے افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کسی کام کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کام کو کریں۔ پھر اسباب اور ذرائع پر غور کر کے انہیں بھی اکٹھا کر لیتے ہیں اور اس کام کا آغاز ہو جاتا ہے۔

چند دن تک تو وہ کام بہت جوش وخروش سے کیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اُس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پہلے سا شوق نہیں رہتا اور پھر ایک دن آتا ہے جب یہ تمام اسباب ووسائل اپنے مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کی بجائے سردمہری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان پر گرد جمنے لگتی ہے اور جو کام بہت جوش وخروش سے شروع کیا گیا تھا اس کا انجام بجز خسارے کے اور کچھ نہیں نکلتا۔

یہ تعمیری کام مطلوبہ نتائج تک نہیں پہنچتے! آخر کیوں؟

اسلیے کہ کسی بھی کام کو اس کے مطلوبہ نتائج تک پہنچانے کیلئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان میں شوق اور ہمت ہو، ایک بہت ضروری چیز تسلسل کے ساتھ محنت کرنا بھی ہے۔ جو لوگ کسی کام کو تسلسل کے ساتھ کرتے رہتے ہیں وہ اپنی ناؤ کو ایک دن ضرور ساحل تک پہنچا کر رہتے ہیں۔

بہت سے بچے اپنی تعلیم کیلئے ضروری سامان مہیا کرتے ہیں۔ چند دن تک شوق سے پڑھتے ہیں لیکن چند دن بعد ہی ان کا شوق کسی اور میدان کو طلب کرتا ہے۔ اپنی تعلیم اسے اُکتا کر کسی اور وادی میں اتر

جاتے ہیں اور انجام کار امتحان میں ناکامی کا داغ لگ جاتا ہے۔

اس کے برعکس کتنے ہی طالب علم ایسے ہوتے ہیں جنہیں اگرچہ تعلیم کا شوق کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن چونکہ ان کی محنت میں تسلسل ہوتا ہے اور وہ تمام سال پڑھتے ہیں اسلئے کامیابی بھی ان کے قدم چومتی ہے۔ کامیابی کا راز ہمت اور شوق کے علاوہ اُس محنت میں پوشیدہ ہے جس محنت میں تسلسل پایا (CONTINUOUS STRUGGLE) جائے۔

حافظ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (۳۹۲ھ-۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:[1]

> فضل بن سعید نے کہا کہ ایک آدمی کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا، لیکن وہ اس میدان میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب علم حاصل نہیں کرے گا۔ اس کا گذر ایک پہاڑ کے پاس سے ہوا جسکی چوٹی سے پانی ایک چٹان پر مسلسل گر رہا تھا اور اس تسلسل نے چٹان میں شگاف پیدا کر دیا تھا۔
>
> وہ بولا:
>
> پانی نے اپنی لطافت کے باوجود مسلسل گر کر چٹان کی کثافت میں یہ شگاف پیدا کر دیا، سو اللہ کی قسم! میں بھی ضرور علم حاصل کروں گا۔ پھر وہ علم کی دھن میں لگ گیا اور علم کو حاصل کر لیا۔

اس کی طلب علم میں صرف ایک چیز کی کمی تھی اور وہ تھا محنت کا تسلسل۔

اس کی نگاہِ بینا نے چٹان کے شگاف کو دیکھ کر اس راز کو جان لیا کہ طالب علم صرف وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنی محنت میں تسلسل پیدا کر لے، یہ کمی دور ہوئی اور وہ بھی عالم بن گیا۔

---

[1] عن الفضل بن سعید بن أسلم قال: "کان رجل یطلب العلم فلایقدر علیه، فعزم علی ترکه، فمرّ بماء ینحدر من رأس جبل علی صخرة، قد أثّر الماء فیها، فقال: الماء علی لطافته قد أثّر فی صخرة علی کثافتها، والله لأطلبنّ العلم. فطلب فأدرك".

(الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع، فصل، رقم ١٠٤٥، ج: ٢، ص: ١٧٩).

1

دو بار ثواب ملنا، کیا امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی خصوصیات میں سے ہے؟

(ا) بعض اہل علم کا یہ خیال ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو ان کے ہر نیک عمل کا دُگنا ثواب دیا جائے گا اور یہ دُگنا ثواب صرف انہی کی خصوصیت ہے۔ یعنی انہوں نے جتنی بھی نیکیاں کیں مثلاً نماز پڑھی، صدقہ کیا، حج یا عمرے کیلئے مکہ مکرمہ حاضری دی وغیرہ وغیرہ......، ان کے تمام اعمال خیر میں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں اُن کا ثواب دُہرا ہے اور یہ دُگنے ثواب کی خصوصیت صرف انہی کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر وہ علمی طور پر قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں؛ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا   اور (اے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی

نُؤْتِهَا اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا .

(پ:۲۲.س:الأحزاب.آیت:۳۱)

بیو یو) جوکوئی تم میں سے اللہ تعالی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اس کو، اس کا ثواب دو بار دیں گے اور ہم نے (ہر) ایسی (نیک بیوی) کیلئے عزت کا رزق مہیا کیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر اہلیہ محترمہ رضی اللہ عنہا جو بھی نیک کام کریں گی اس کا ثواب انہیں دو مرتبہ دیا جائے گا اور یہ صرف انہی کی خصوصیت ہے۔

اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو ان کے ہر اچھے عمل کا ثواب دُگنا دیا جائے گا کیونکہ یہ آیتِ کریمہ قطعی طور پر اس کا بات کا فیصلہ کر دیتی ہے لیکن اس آیت سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دوگنا ثواب (مَـرَّتَیْـنِ) صرف انہی کی خصوصیت ہے، ممکن نہیں، بلکہ اللہ تعالی نے دیگر بہت سے افراد اور جماعتوں کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ نیک اعمال کا اجر انہیں بھی دُگنا دیا جائے گا، بنا بریں پھر اس دُگنے ثواب میں امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی تخصیص کرنا درست نہیں۔

مثال کے طور پر وہ قومیں جنہیں قرآن کریم سے قبل کوئی کتاب دی گئی جیسے تورات یہودیوں کو، اور انجیل عیسائیوں کو، تو یہ اہل کتاب یہودی یا عیسائی جب اسلام قبول کر کے کوئی نیکی کا کام کریں گے تو انہیں بھی دُوگنا ثواب ہوگا۔ کیونکہ پہلے وہ اپنے نبی علیہ الصلاۃ والسلام اور اپنی کتاب پر ایمان رکھتے تھے اور اب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن کریم پر ایمان لائے ہیں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ . وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ . اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ

اور وہ جس کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی ہے، وہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب انہیں یہ (قرآن) سنایئے تو وہ کہتے ہیں ''ہم اس (قرآن)

مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ.

(پ: ۲۰. س:القصص. آیت:۵۴،۵۲)

پر ایمان لاتے ہیں بلاشبہ یہ (کتاب) حق ہے جو کہ ہمارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور ہم تو اس سے پہلے بھی (اللہ تعالیٰ کا) حکم ماننے والوں میں سے تھے"۔ یہ لوگ ہیں جنہیں دوگنا ثواب ملے گا کیونکہ یہ (سچائی پر) جم گئے اور یہ لوگ برائی کے جواب میں بھلا سلوک کرتے ہیں اور ہمارے دیے میں سے کچھ خرچ (بھی) کرتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں یہودی اور عیسائی نومسلم حضرات وخواتین کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے دُگنے (مَرَّتَيْنِ) اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُگنے اجر کو صرف عزت مآب امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ پھر اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہونے والی حقیقت کی تائید اس حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جو صحیح بخاری میں ہے۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[1]

ثلاثة لهم اجران: رجل من أهل الكتاب آمن بنبيه وآمن بمحمد ﷺ، والعبد المملوك اذا أدّي حق الله وحق مواليه. ورجل كانت عنده أمة فأدّبها فأحسن تأديبها، وعلّمها فأحسن تعليمها، ثم أعتقها فتزوجها، فله أجران.

تین آدمی ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا دُگنا ثواب دے گا:

(1) اہل کتاب کا ہر وہ شخص جو پہلے اپنے نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لایا تھا اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

(2) وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کو نباہ لیا اور اپنے آقاؤں کا فرمانبردار رہا۔

---

[1] كتاب العلم، باب تعليم الرجل امته و اهله، رقم الحديث: ۹۷.

ثم قال عامر: أعطينا كها بغير شيء، قد كان يركب فيما دونها الى المدينة.

(3) وہ شخص جس کے پاس کوئی باندی تھی، پھر اس شخص نے اس کی اچھی تربیت کی اور اُسے زندگی کا سلیقہ سکھایا پھر اسے تعلیم دی اور بہت اچھی تعلیم دی پھر اس کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی۔ تو اس شخص کیلئے بھی دُہرا اجر ہے۔

یہ حدیث سنا کر حضرت عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد صالح بن حبان سے فرمایا:

''ہم نے تمہیں مفت میں یہ حدیث سنا دی ورنہ اس سے بھی چھوٹی حدیث سننے کیلئے ہمارے دور میں مدینہ منورہ کا سفر کرنا پڑتا تھا''۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْلَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

(پ:۲۷۔س:الحدید۔آیت:۲۸)

اے ایمان والو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور ایمان لاؤ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، وہ (اللہ تعالیٰ) تمہیں اپنی رحمت سے دُگنا حصہ دے گا اور تمہارے لیے ایک روشنی مہیا کر دے گا جس کی مدد سے تم (راہ دیکھ کر) چلو گے اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادے گا، اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ہر متقی اور مومن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ ایمان اور تقوی کی بنیادی شرائط پر پورا اترے گا تو اُسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دُگنا حصہ عنایت فرمائے گا۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ اس دُگنے ثواب (مَـرَّتَيْـنِ) میں ازواج مطہرات امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ان کے مقام اور مرتبے کے مطابق دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس انعام میں ان کے برابر ہی ہیں۔

اس عدم تخصیص پر تیسری دلیل بھی قابل غور ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ.

(پ:۲۲، س:سبا، آیت:۳۷)

اور نہ ہی تمہارے مال اور نہ ہی تمہاری اولاد تمہیں ہمارے (اللہ تعالیٰ کے) قریب کردیتے ہیں، ہاں مگر جو شخص ایمان لایا اور اس نے اچھا عمل کیا تو ایسے لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا دُہرا ثواب ملے گا اور وہ (جنت کے) بالا خانوں میں سکھ، چین سے رہیں گے۔

اس آیت کریمہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دُہرا اجر (مرّتین) ہر اس شخص کو ملے گا جو ایمان لایا اور اس نے اعمال صالحہ انجام دیئے۔

اسلئے جن اہل علم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے، ان کا دعویٰ، مندرجہ بالا دلائل کی رُو سے ثابت نہیں ہوتا۔

②

کیا چھوٹی مساجد میں عیدین اور جمعہ کی نماز پڑھانا، روحِ شریعت کے مطابق ہے؟

امام اکبر، حکیم الاسلام حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں شریعتِ مطہرہ کے مقاصد پر بحث کرتے ہوئے عیدین کے اجتماعات کو بھی ضروری

قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ ہر قوم کوئی نہ کوئی دن ایسا مقرر کرتی ہے، جس میں اس کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور ان کی کثرتِ تعداد کا دوسری اقوام پر رعب پڑے۔ اس لئے مسلمانوں کیلئے یہ بہتر قرار دیا گیا کہ وہ عید کے دن اجتماعی حیثیت سے عیدگاہ میں آئیں۔ یہاں تک کہ بچے، عورتیں اور پردہ دار خواتین تک حاضر ہوں اور وہ خواتین جو اپنے شرعی عذر کی وجہ سے نماز عید ادا نہیں کر سکتیں، نماز تو ادا نہ کریں لیکن دیگر مسلمانوں کے ساتھ دعا میں تو شریک ہوں۔

مسلمانوں کی شان و شوکت کا خوب اظہار ہو اور اسی مصلحت کے تحت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں آتے اور جاتے وقت اپنا راستہ تبدیل فرما لیا کرتے تھے تاکہ دونوں راستوں کی آبادیوں کو مسلمانوں کی عظمت اور کثرتِ تعداد سے آگاہی حاصل ہو[1]

شریعت مطہرہ کا، یہی مقصد اور حکمت، اجتماع جمعہ میں بھی ہے۔ مسلمان ہر جگہ سے آئیں، ایک مقام پر جمع ہو کر نماز جمعہ ادا کریں۔ ان کا اجتماع اور شان و شوکت دیکھ کر کمزور مسلمانوں کی ہمت بڑھے۔ جمعہ کو ترک کرنے والے نمازیوں کو جمعہ قائم کرنے کی ترغیب ہو۔ لاتعداد مسلمانوں کی دعائیں قبولیت کے دروازے پر دستک دیں اور معلوم نہیں کس مخلص یا گنہگار کی دعا درجہ قبولیت حاصل کرے اور بہتوں کا بھلا ہو۔ بچے ان اجتماعات کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوں اور ان کی دینی تربیت ہو۔ اگر مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ وہاں رہتے ہیں تو ان تک اسلام کی دعوت کا ایک خاموش پیغام پہنچے اور ممکن ہے انہیں رجوع الی اللہ کی توفیق ملے۔

انہی وجوہ کی بنا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مدینہ منورہ میں ۹ مساجد

۱۔ وضم معہ مقصدا آخر من مقاصد الشریعۃ، وھو أن کل ملۃ لابد لھا من عرضۃ، یجتمع فیھا أھلھا، لتظھر شوکتھم، وتعلم کثرتھم، ولذلک استحب خروج الجمیع، حتی الصبیان والنساء، وذوات الخدور، والحیّض ویعتزلن المصلی، ویشھدن دعوۃ المسلمین، ولذلک کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخالف فی الطریق ذھابا وإیابا، لیطلع أھل کلتا الطریقین علی شوکۃ المسلمین.

(باب:۱۷ 《العیدان》، ج:۲، ص:۱۰۰)

تھیں۔

(۱) مسجد بنو عمرو بن مبذول (یہ مسجد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال بنو نجار کی تھی)

(۲) مسجد بنو ساعدہ۔

(۳) مسجد بنو عبید۔

(۴) مسجد بنو سلمہ۔

(۵) مسجد بنو رابح (یہ مسجد قبیلہ بنو عبد الأشہل کی تھی)۔

(۶) مسجد بنو زریق۔

(۷) مسجد بنو غفار۔

(۸) مسجد اسلم۔

(۹) مسجد جہینہ۔

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں آذان دیتے تھے او جونہی اس آذان کی آواز دیگر مساجد میں پہنچتی تھی، لوگ نماز شروع کر دیتے تھے[1]

لیکن جمعہ کی نماز کسی مسجد میں نہیں ہوتی تھی۔ پورا شہر صرف ایک مسجد میں نماز پڑھتا تھا اور وہ مسجد تھی مسجد نبوی، کسی طور سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ

۱۔ حدثنا محمد بن سلمة المرادي،حدثنا ابن وهب،عن ابن لهيعة أن بكير بن الأشجّ حدّثه أنه كان بالمدينة تسعة مساجد مع مسجد النبي ﷺ ،يسمع أهلها تأذين بلال على عهد رسول الله ﷺ،فيصلون في مساجدهم،أقربها مسجد بني عمرو بن مبذول من بني النجار،ومسجد بني ساعدة،ومسجد بني عبيد،ومسجد بني سلمة،ومسجد بني رابح من بني عبد الأشهل،ومسجد بني رزيق،ومسجد بني غفار،ومسجد أسلم،ومسجد جهينة،ويشك في التاسع.

(المراسيل لأبي داود رحمة الله عليه، كتاب الطهارة،من الصلاة،رقم:١٥)

میں کسی ایک مسجد والوں کو بھی جمعہ قائم کرنے کی اجازت دی ہو حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کے قرب وجوار میں جو گاؤں تھے انہیں بھی جمعہ قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہو، اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا[1]۔ کیونکہ اگر لوگ شہر اور گاؤں جگہ جگہ جمعہ قائم کر لیتے تو مسلمانوں کی اجتماعی شوکت وعظمت کا مظاہرہ جو کہ مقاصد شریعہ میں سے ہے، ختم ہو کر رہ جاتا۔ اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تو یہ فتویٰ دیتے تھے کہ جمعہ صرف اس بڑی مسجد میں ہوگا جس میں امام وقت نماز جمعہ قائم کرے گا، اس مسجد کے علاوہ کسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے والے کا جمعہ نہیں ہوگا۔[2]

ان کے والد گرامی قدر امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تین کبار صحابہ رضی اللہ عنہم جو اپنے اپنے شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کے قائدین تھے، انہیں گرامی نامہ تحریر فرمایا کہ مفتوحہ شہروں میں پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کیلئے مساجد تعمیر کی جائیں۔ مختلف قبائل کیلئے ان کی مساجد کی تعمیر کی جائے لیکن نمازِ جمعہ کیلئے ایک ہی بڑی مسجد ہوگی جہاں سارے شہر کی آبادی نمازِ جمعہ ادا کرے گی۔

یہ گرامی نامہ بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری، کوفہ کے امیر حضرت سعد بن ابی وقاص اور مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام تھا۔[3]

مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کی مرکزیت قائم رہے اور ان کی اجتماعی عبادت بھی مثالی ہو۔

صرف سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہی نہیں، خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام خلفائے راشدین کا عمل یہی تھا کہ جمعہ کی نماز، پورے شہر کی آبادی ایک ہی مقام پر ادا کرتی تھی۔

ا۔ ولم ينقل أنه أذن لأحد في اقامة الجمعة في شيء من مساجد المدينة، ولا في القرى التي بقربها.

(التلخيص الحبير، كتاب الجمعة، رقم: ٦٢١، ج: ٢ ص: ٥٥).

٢۔ وروى ابن المنذر عن ابن عمر أنه كان يقول: لا جمعة إلا في المسجد الأكبر الذي يصلي فيه الامام.

(التلخيص الحبير، كتاب الجمعة، رقم: ٦٢١، ج: ٢، ص: ٥٤)

٣۔ تاريخ دمشق الكبير، باب ذكر معرفة مساجد البلد وحصرها بذكر التعريف لها و العدد، ج: ٢، ص: ٢١١.

انہی احادیث وآثار کی بناپر امام محمد بن ادریس الشافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کا فتویٰ یہ تھا کہ کسی بھی شہر میں، نمازِ جمعہ، صرف ایک ہی مقام پر جائز ہے۔[1]

شہروں میں آبادی بڑھنے لگی اور جن ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ کی نگاہ، ان آبادیوں کا مستقبل آئینہ حال میں دیکھ رہی تھی ان میں ایک ہستی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی آبادیاں پھیلیں گی اور ان کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ پورے شہر کی آبادی ایک ہی مقام پر جمع ہو کر نمازِ جمعہ ادا کرے، یہ ممکن نہیں رہے گا۔ اس لئے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ہی شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ قائم کرنے کی اجازت دے دینی چاہئے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا اور ان کے کئی ایک اجتہادی فیصلوں کی بنیاد امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہی کا کوئی فتویٰ ہوا کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصل مسلک تو اگرچہ یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کے اس اجتماع کو ایک ہی مقام پر دیکھنا درست خیال فرماتے تھے لیکن حالات وواقعات کے تحت وہ اس بات کی بھی اجازت دے دیتے تھے کہ مسلمان جہاں بھی جمع ہوں، جمعہ ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ آپ حضرات جہاں بھی جمع ہو جائیں، نمازِ جمعہ قائم کر لیں۔[2]

اس لئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے معاشرتی مسائل کے پیشِ نظر اس بات کی اگرچہ اجازت دی کہ مسلمان کسی بھی شہر میں ایک سے زائد مقامات پر نمازِ جمعہ قائم کر سکتے ہیں[3] لیکن پھر بھی عملی

۱ـ (تنبیه) قول الرافعي والأصحاب: ان الشافعي دخل بغداد وهي تقام بها جمعتان مردود بأن الجامع الآخر لم يكن حينئذ داخل سورها، فقد قال الأثرم لأحمد: أجمع جمعتين في مصر؟ قال: لا أعلم أحداً فعله. (التلخيص الحبير، كتاب الجمعة، رقم: ٦٢١، ج: ٢، ص: ٥٥)

۲ـ وروى سعيد بن منصور عن أبي هريرة: أن عمر كتب إليهم أن جمعوا حيث ما كنتم. (التلخيص الحبير، كتاب الجمعة، رقم: ٦٢١، ج: ٢، ص: ٥٤)

۳ـ وتؤدى الجمعة في مصر واحد في مواضع كثيرة وهو قول أبي حنيفة و محمد رحمهما الله تعالى وهو الاصح وذكر الامام السرخسي انه الصحيح من مذهب أبي حنيفة رحمه الله تعالى و به نأخذ. –

طور پر مسلمانوں نے کبھی ایسے نہیں کیا کہ ایک ہی شہر میں متعدد مقامات پر نمازِ جمعہ ادا کریں۔

۲۸۰ھ تک حالات ایسے ہی رہے۔ سیاسی حالات میں تغیر آیا اور حکمرانوں کیلئے عام مساجد میں مسلمانوں کے ساتھ جمعہ پڑھنا دشوار ہوگیا، زندگی کو خطرات لاحق ہوگئے اور بغداد شہر میں مسجد قدیم میں جمعہ ہونے کے باوجود پہلی مرتبہ خلیفہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ) نے ایک دوسری مسجد میں اپنے تحفظ کی خاطر دوسرا جمعہ قائم کیا۔[1]

اگر اس ساری تاریخ پر غور کیا جائے تو آسانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شہر یا بستی میں جمعہ درحقیقت ایک ہی مقام پر ہونا چاہئے اور یہ بھی چاہئے کہ مسلمانوں کا امیر ہی انہیں جمعہ پڑھائے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہمایونی سے لیکر تبع تابعین رحمہم اللہ کے آخری دور کے بعد تک امت کا تعامل یہی رہا۔

شہر بہت بڑا ہے یا پھر ایک ہی مسجد میں پوری آبادی نہیں سما سکتی تو انتظامی امور کے تحت شہر میں متعدد مقامات پر بھی جمعہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن ہر مقام پر چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں بھی جمعہ قائم کر لینا شریعت کے مقصد و منشاء کو گویا کہ ختم کرنا ہے۔ اس دور میں ایسی مساجد میں بھی جمعہ قائم ہونے لگا ہے جہاں نمازیوں کی تعداد صرف ایک سو بھی نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے قریوں، کوچوں اور چند گھرانوں پر مشتمل دیہات میں بھی جمعہ اور عیدین کی نمازیں قائم کر لی جاتی ہیں۔ کیا اس طرح کی بے اعتدالیوں

۔ ھکذا فی البحر الرائق.

(الفتاوی الھندیة، کتاب الصلوة، الباب السادس عشر فی صلاة الجمعة، ج: ۱، ص:۱٤٥).

[1] وذکر الخطیب فی تاریخ بغداد: أن أول جمعة أحدثت فی الإسلام فی بلد مع قیام الجمعة القدیمة، فی أیام المعتضد فی دار الخلافة، من غیر بناء مسجد لإقامة الجمعة، و سبب ذلك خشیة الخلفاء علی أنفسھم فی المسجد العام، و ذلك فی سنة ثمانین و مائتین.

(التلخیص الحبیر، کتاب الجمعة، رقم: ٦٢١، ج: ۲، ص:٥٥)

سے مسلمانوں کی اجتماعی شان وشوکت متاثر نہیں ہوتی؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

باغباں نقصاں کرے تو کون رکھوالی کرے
کیوں نہ اجڑے باغ؟ جب مالی ہی پا مالی کرے

③

تاریخ وتردیدِ بدعات

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ہی بدعات نے شریعتِ مطہرہ میں نقب لگا لیا تھا، لیکن علوم نبوت کے وارثین چونکہ موجود تھے اس لیے عمومی معاشرے نے اُسے قبول نہیں کیا اور بدعات اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہیں۔ اُس دور کے بدعتی عقیدے میں علمی بدعات کے داعی تھے کیونکہ معاشرے پر علم کا غلبہ تھا۔ تابعین کے دور میں علوم مدوّن ہونے شروع ہوئے اور اہل بدعت کے مختلف گروہ خوارج، معتزلہ، قدریہ وغیرہ وغیرہ سامنے آئے اور اہل السنۃ والجماعۃ نے ہر میدان میں اُن کا بھرپور تعاقب کیا۔ علمی طور پر گرفت کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے دلائل دم توڑ گئے اور یہ فرقے چند صدیوں میں ہی ختم ہو گئے۔

جب مجموعی اعتبار سے امت کا زوال شروع ہوا تو علمی اقدار پر بھی زوال آیا۔ نہ وہ راسخ العلم افراد باقی رہے اور نہ ہی ان کے منجھے ہوئے مخالفین، جن کی بدعات کی نوعیت بھی علمی رنگ کی تھی۔

اب متاخرین میں علم نہ ہونے کی وجہ سے علمی بدعات کا ظہور زیادہ ہوا، اور ایسی ایسی بدعات شروع ہوئیں، جن کے ردّ کے لیے اہل علم بہر طور کوشش کرتے رہے لیکن معاشرے نے اپنی جہالت کے سبب اُن کو اپنا لیا۔ شہروں کے شہر اور ملکوں کے ملک ان بدعات کی لپیٹ میں آ گئے اور اہل علم کی آزمائش کے

لیے نئے دارورسن تیار ہوئے۔ان بدعات کے خلاف بولنا گویا کہ جان کو ہتھیلی پر رکھنا تھا۔
بہت سے افراد جن کا شمار بظاہر اہل علم میں کیا جاتا تھا، ان بدعات کی سرپرستی کرتے رہے اور جس جاہل نے بھی سنت کے مقابلے میں بدعت اختیار کی، یہ اپنے آپ کو اہل علم کہلوانے والے، اس بدعت کو بدعتِ حسنہ قرار دیکر اس کے جواز میں فتوے مرتب کرنے اور بے بنیاد تاویلات کی سعی لاحاصل، کرنے کے دھندے میں لگ گئے۔
ان اہل علم کے تسامحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ امتِ مسلمہ کا ہر طبقہ ان بدعات سے متاثر ہوا، جس طبقے میں بیدار مغز متبع سنت افراد کا غلبہ تھا وہاں بدعات کم جمیں اور جس طبقے میں اتباع سنت کا غلبہ نہیں تھا وہاں تو ان بدعات نے ایک نیا ''دین الٰہی'' تشکیل دیا۔
ان بدعات کی ترویج میں جہاں اور بہت سے عناصر کارفرما تھے، ایک بڑا طبقہ ان بے علم واعظ حضرات کا بھی تھا، جو عوام کو متاثر کرنے اور ان سے مال ہتھیانے کے لیے ان بدعات کی ترویج میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔
محراب ومنبر سے ہی جب بدعات کی تبلیغ ہونے لگے تو عوام اتباع سنت کی راہ کس سے دریافت کریں؟ محراب ومنبر نبوی علیہ الصلاۃ والسلام کے وارثین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیشہ عوام کی صحیح رہنمائی کریں۔ وہ علم حاصل کریں جو توحید وشرک، سنت وبدعت اور حلال وحرام کی تمیز سکھاتا ہو۔ پھر اس علم کو عام کریں اور منبر کے ذریعے عوام الناس کو یہ صحیح راہ دیکھائیں!
اگر وہ یہ علم نہ رکھتے ہوں، اور عوام کو صحیح بات نہ بتا سکتے ہوں تو پھر ان کا منبر پر بیٹھنا، کبیرہ گناہ سے کچھ کم نہیں۔
اسی بات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے۔ کہ منبر پر بیٹھنے کی ذمہ داری کیا ہے؟۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم جب اپنے منبر پر تشریف فرما ہوتے تو اس آیت کریمہ کی تلاوت فرماتے:[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا — اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور ہمیشہ صاف اور

[1] المراسيل لابي داؤد، رقم: ٦٠، ص: ١٠٤

سَدِيْدًا. سچی بات کہا کرو۔

(پ: ۲۲، س: الاحزاب، آیت: ۷۰)

مگر جب منبر پر وہ بے علم اور بد عمل واعظ آئے جن کا مقصد ہی دنیا کمانا تھا تو پھر اِن بدعات نے زور پکڑا اور ایسا زور کہ بدعات اصل قرار پائیں اور متبعین سنتِ مطہرہ معتوب قرار پائے۔

نمازِ مغرب کے بعد، تین رکعات پر مشتمل، ایک اور نماز شروع کی گئی۔ باقاعدہ جماعت کے ساتھ، بہت خشوع وخضوع سے وہ تین رکعتیں پڑھی جاتیں اور اس نماز کا نام ''صلاۃ برّ الوالدین'' رکھا گیا یعنی اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی نماز۔ اور اِس نماز کی غرض و غایت یہ قرار پائی کہ ہر شخص سے والدین کی خدمت میں کوئی نہ کوئی کوتاہی ہو ہی جاتی ہے اس لیے کوتاہیوں کی تلافی کے لیے انہیں ایصال ثواب کیا جائے اور اِس مقصد کے لیے اس بدعت کو گھڑا گیا۔

عوام تو پہلے سے ہی اپنے والدین سے محبت اور ان کے ایصال ثواب کا اہتمام کرتے تھے، اس نماز میں جوق در جوق شریک ہونے لگے اور ایک صحیح عمل (ایصال ثواب) کی آڑ میں، خوبصورت لباس (نماز) کے رنگ میں، ایک حرام کام (بدعت) شروع ہوا۔

کچھ لوگوں نے اُن تمام مُردوں کے ایصال ثواب کا اہتمام کیا جو مسلمان تھے اور دنیا کے کسی خطّے میں کسی بھی زمانے میں انتقال کر گئے تھے۔ ہر رات کو ایک غائبانہ نماز جنازہ شروع ہوئی اور امام صاحب نماز عشا کے بعد روزانہ ایک غائبانہ جنازہ پڑھاتے اور مرحومین کو ایصال ثواب کیا جاتا۔[1]

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں ''نمازوں'' کی بدعت کا ذکر کرنے سے پہلے بدعات کا مقصد بیان فرمایا ہے اور سچے کی بات لکھی ہے کہ:[2]

---

[1] كان بعض أهل القرى يصلون بعد المغرب صلاة مثل المغرب في جماعة يسمونها صلاة برّ الوالدين. و كما كان بعض الناس يصلي كل ليلة في جماعة صلاة الجنازة على من مات من المسلمين في جميع الأرض و نحو ذلك من الصلوات الجماعية لم تشرع.

(اقتضاء الصراط المستقيم، بدع صلاة الجنازة بعد المغرب، ص: ۳۰۳)

[2] اقتضاء الصراط المستقيم، التوسيع في عاشوراء باطل، ص: ۳۰۱.

ان الشیطـان قصـده ان یحرف الخلق عن الصراط المستقیم، ولا یبالی إلی أی الشقین صاروا.

(ان بدعات سے) شیطان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کو صحیح راہ سے ہٹائے اور اُسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ (ان بدعات کا ارتکاب کر کے) جنت میں جائیں یا جہنم میں۔

حضرت مجدّ دالفِ ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے اُن علماء ومشائخ پر شدید نکتہ چینی کی ہے جو بدعاتِ حسنہ کے نام پر بدعت کو فروغ دیتے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:[1]

بعضے از بدعتہا کہ علماء و مشائخ آنراحسنہ دانستہ اندچون نیک ملاحظہ نمودہ می آید معلوم میشود کہ رافع سنت اند مثلاً در تکفین میّت عمامہ را بدعت حسنہ گفتہ اندبآنکہ ہمین بدعت رافع سنت است چہ زیادتی بر عدد مسنون کہ سہ ثوب باشد نسخ است و نسخ عین رفع۔

بعض بدعات ایسی ہیں کہ علماء ومشائخ انہیں بدعتِ حسنہ کہتے ہیں لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بدعاتِ حسنہ، درحقیقت سنت کو ختم کرنے والی ہیں۔ مثلاً یہ علماء ومشائخ کفن میں میت کے سر پر عمامہ باندھنے کو بدعتِ حسنہ قرار دیتے ہیں حالانکہ غور کیا جائے تو یہ نری بدعت ہے۔ اس سے سنت ختم ہو جاتی ہے۔ کفن میں تین چادریں سنت ہیں تو جب عمامہ بھی ہوگا تو کپڑے تین سے چار ہو جائیں گے اور تین کی تعداد کی سنت ختم ہو جائے گی۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ بدعات پر شدید نکیر فرمایا کرتے تھے اور اپنے آخری دورِ حیات میں بزمانہ قیام لکھنؤ ہم نے خود دیکھا کہ اپنے مولد ومدفن، رائے بریلی کے قصبے کی طرف اشارہ کر کے اپنے بعض قریبی اعزّا سے بار بار فرمایا کرتے تھے ''خبردار رائے بریلی کے اس ٹکڑے میں بدعات ہرگز نہ گھسنے پائیں''۔

الندوہ (پاکستان) بدعات سے تنفر اور بیزاری میں ٹھیک اُسی منہج کا داعی اور راہ رَو ہے جو منہج کتاب وسنت اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ سے ثابت، اور جس راہ پر حضرت مجدّ دالفِ ثانی سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی زندگیاں بسر کی ہیں۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ، دفتر اول، حصہ سوم، مکتوب نمبر ۱۸۶، ج:۱، ص:۷۳۔
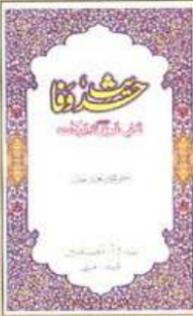
ارباب ذوق کی خدمت میں "حدیث وفا" کے عنوان سے عشق و محبت کا ایک گراں قدر ہدیہ پیش کیا جارہا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے رنگ میں ڈوب کر یہ سطور سپردِ قرطاس کی گئی ہیں۔ مردِ خدا کے لئے متاعِ کونین سے عزیز تر اور اس کا حاصل حیات وہ ناطہ ہے، جو اللہ تعالیٰ اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پیوست ہے۔

"حدیث وفا" اسی ناطے کو سرسبز و شاداب رکھنے کا سامان اور اسی عہد وفا کی تذکیر ہے جو صبح ازل میں منعقد ہوا تھا اس کتاب کا محور یہی ہے اور تمام روایات اسی مرکز کے گرد مصروف بطواف ہیں۔

"حدیث وفا" ان دیوانگان عشق کے تذکرے سے بھی معمور ہے جن کی عقل کی منزل اور عشق کا حاصل رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود تھا۔ وہ جس ذات کو دیکھ کر جیتے تھے اسی کے پیغام کو پھیلانے میں مرمٹے۔ ان پیکران وفا کا ذکرِ خیر ان سے مربوط ہونے کی دلیل اور ان کے حالات اس خبر کے پیغام رساں کہ۔

عشق کی مستی سے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

محدثین عظام اور فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہ نے جن احادیث اربعہ کو امہات میں شمار کیا ہے "حدیث جبریل" ان میں سے ایک ہے۔

حدیث جبریل میں کامل دین کو تین شعبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) ایمان (۲) اسلام (۳) احسان

"حدیث وفا" کا قاری ذرا تعمق نظر سے جائزہ لے تو ان تینوں شعبوں کی روح جو عمل پر آمادہ اور مہمیز شوق لگاتی ہے، وہ "عشق و محبت" ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات

"حدیث وفا" اسی عشق کی بادِ بہاری کا نام ہے۔ ہر حکایت اور ہر روایت اس اصل حیات کو فروغ دیتی ہے۔ مصنف نے روشنائی کی بجائے مے عشق سے یہ ارمغان مرتب کیا ہے۔ کیا عجب کہ کسی دل کے نہاں خانے میں پھر سے یہ حدیث وفا حدیث عشق کی بجلی سلگا دے۔

ادارہ المناد، شفیع پلازہ، بینک روڈ صدر، راولپنڈی۔

فون نمبر: 0092-51-5111725

موبائل: 0092-333-5134333

ڈیکلریشن نمبر: 28/Press,Dec

AL NADWA

MONTHLY

Muharram 1431/ January 2010

Volume- 1

Issue- 1

Printed and published at Instant Print System (Pvt) Ltd.

G-10/4, Islamabad by Muhammad Rashid

on behalf of

AL-NADWA EDUCATIONAL TRUST

CHATTER PARK ISLAMABAD

PAKISTAN 46001